جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد

مولانا فیض احمد بدایونی

پروفیسر محمد ایوب قادری

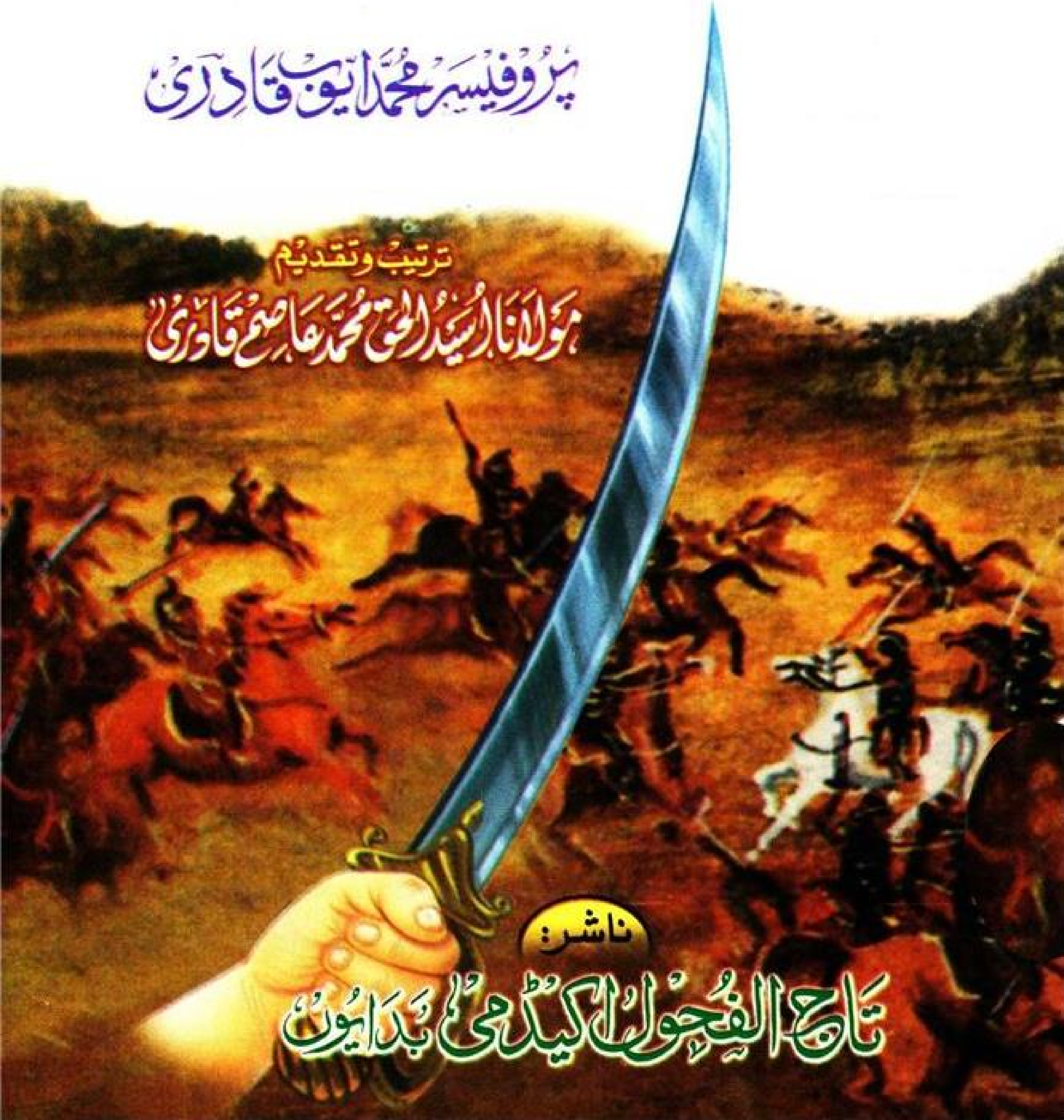

ترتیب و تقدیم

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

ناشر:
تاج الفحول اکیڈمی بدایوں

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد

مولانا فیض احمد بدایونی

پروفیسر محمد ایوب قادری

ترتیب وتقدیم

مولانا اُسید الحق محمد عاصم قادری

خانقاہ منعمیہ قمریہ
ملا میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی - ۸

ناشر:

تاج الفحول اکیڈمی بدایوں

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

☆

کتاب : مولانا فیض احمد بدایونی
مرتب : پروفیسر محمد ایوب قادری
مقدمہ : اسید الحق محمد عاصم قادری
تصحیح : تسنیم حسن قادری
طبع اول : پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۷ء
طبع جدید : تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۲۰۰۷ء
کمپوزنگ : سید طارق علی (طیبہ کمپیوٹر سوتھا بدایوں)
تقسیم کار : مکتبہ جام نور 422، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی-6
قیمت :

☆☆☆

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
انتساب	۴
مقدمہ	۵
پیش لفظ	۲۷
مولانا فیض احمد بدایونی	۲۹
خاندان	۳۰
پیدائش	۳۳
تعلیم و تربیت	۳۳
بیعت	۳۴
درس و تدریس	۳۵
ملازمت	۳۵
قیام آگرہ	۳۶
مناظرہ	۳۸
جامع مسجد آگرہ کا ایک خاص واقعہ	۴۰
آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد	۴۱
انقلاب ۱۸۵۷ء	۴۳
واقعات دہلی	۴۵
ہنگامۂ کارزار	۴۶
ورود لکھنؤ	۴۸
معرکۂ بدایوں (ککرالہ)	۴۹
شاہ جہاں پور	۵۲
قصبہ محمدی میں قیام حکومت	۵۲
مولوی فیض احمد بدایونی کی روپوشی	۵۳
سخن گستری	۵۴
شاعری	۵۷
تصنیفات	۶۲
اولاد	۶۳
خاتمہ	۶۴

☆☆☆

انتساب

یہ اوراق بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان کے ایک سرفروش اور کفن بردوش مجاہد حضرت مولانا فیض احمد بدایونی کی داستانِ حیات پر مشتمل ہیں۔ جنھوں نے جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں ملک وملت کی آزادی کے لئے جان عزیز تک قربان کردی۔ میں اس ناچیز تالیف کو اسی خاندان کے ایک علم دوست اور معارف پرور نوجوان صاحبزادہ مولوی عبدالمجید اقبال میاں قادری بدایونی کے اسم گرامی پر معنون کرنے میں مسرّت محسوس کرتا ہوں۔

محمد ایوب قادری
۷؍ مئی ۱۹۵۷ء

مقدمہ

برصغیر میں ۲۰۰۷ء کو انقلاب ۱۸۵۷ء کی ڈیڑھ سو سالہ برسی کے طور پر منایا جارہا ہے اس موقع پر ان مجاہدین کو یاد کیا جارہا ہے جنھوں نے وطن عزیز کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا، قوم وملت کے انہیں جاں باز اور سرفروش مجاہدین میں خانوادۂ عثمانیہ کے چشم و چراغ مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے قائد جہاد حریت علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتویٰ جہاد پر نہ صرف یہ کہ تصدیقی دستخط کئے بلکہ عملی طور پر بھی ہر طرح جہاد آزادی میں حصہ لیا۔ یہ مختصر رسالہ اسی مجاہد آزادی کی حیات وخدمات کا تعارف پیش کررہا ہے۔

خانوادۂ عثمانیہ بدایوں نے اپنے اس عظیم فرزند اور اس کی خدمات کو ہر موقع پر یاد کیا ہے آج سے پچاس برس پہلے جب جہاد آزادی کی سو سالہ سالگرہ منائی جارہی تھی تو حضرت عبدالمجید اقبال میاں قادری عثمانی کی کوششوں سے زیر نظر رسالہ منظر عام پر آیا، ۱۹۹۷ء میں جب آزادئ ہند کی پچاسویں سالگرہ منائی جارہی تھی تو تاج الفحول اکیڈمی بدایوں نے دسمبر ۱۹۹۷ء میں بدایوں میں مولانا فیض احمد بدایونی کی حیات وخدمات پر ایک سیمینار منعقد کیا ازاں بعد سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو ''آئینہ مقالات'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ آج جہاد آزادی کی ڈیڑھ سوویں سالگرہ منائی جارہی ہے اس سلسلہ میں ماہنامہ جامِ نورِ دہلی نے ۱۸۵۷ء پر خصوصی شمارہ شائع کیا جس کے لئے راقم السطور نے مولانا فیض احمد بدایونی پر خصوصی مضمون لکھا جو جام نور ستمبر میں شائع ہوا، اسی سال نومبر ۲۰۰۷ء میں دارالعلوم وارثیہ لکھنؤ میں ''جہاد آزادی ۱۸۵۷ء'' کے عنوان سے ایک قومی سیمینار منعقد کیا

گیا جس میں راقم السطور نے مولانا فیض احمد بدایونی کی حیات و خدمات پر مقالہ پڑھا، اور اب تاج الفحول اکیڈمی زیرِ نظر رسالہ کو شائع کر کے خانوادۂ عثمانیہ کے اس عظیم فرزند اور جہاد آزادیٔ وطن کے اس جاں باز سپاہی کو ایک بار پھر یاد کر رہی ہے۔

☆ مصنف رسالہ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک جانا پہچانا نام ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم تاریخ کے محقق، سوانحی ادب کے ممتاز قلم کار اور فارسی ترجمہ نگاری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کی تحقیقات اور تراجم کو عموماً علمی حلقوں میں اعتبار و استناد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری کی پیدائش ۱۹۲۶ء میں قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) میں ہوئی ان کے والد مولوی مشیت اللہ آنولوی فارسی کی استعداد رکھنے والے ایک دیندار شخص تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی عربی فارسی اپنے والد سے پڑھی، ۱۹۴۲ء میں مڈل، ۱۹۴۷ء میں میٹرک اور ۱۹۵۰ء میں حافظ صدیق اسلامیہ کالج بدایوں سے انٹر پاس کیا، ۱۹۵۰ء ہی میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ ۱۹۵۶ء میں اردو کالج کراچی سے بی. اے. کیا اور ۱۹۶۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم. اے. پاس کیا۔ انہوں نے ”اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ“ (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا جس پر ۱۹۸۰ء میں کراچی یونیورسٹی نے انہیں پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری تفویض کی۔ ابتداءً وہ اردو کالج کراچی میں جز وقتی لکچرار ہوئے اور مارچ ۱۹۶۳ء میں اسی کالج میں مستقل لکچرار کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ آخر میں صدر شعبہ کے عہدہ تک ترقی کی۔ متعدد علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہے۔ سہ ماہی ”العلم“، کراچی کے مستقل قلم کار رہے۔ کئی تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑیں:۔

۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی : پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۷ء
۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت : ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی ۱۹۶۳ء
۳۔ مولانا احسن نانوتوی : روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی ۱۹۶۶ء

۴۔ ارباب فضل وکمال بریلی : کراچی ۱۹۷۰ء
۵۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء : مطبوعہ ۱۹۷۶ء
۶۔ غالب اور عصر غالب : غضنفر اکیڈمی کراچی ۱۹۸۲ء
۷۔ کاروان رفتہ : کراچی ۱۹۸۳ء

متعدد فارسی کتابوں کے ترجمہ کئے اور ان کو تحقیقی مقدمات اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا، ان کے تراجم میں تین کتابیں خصوصیت کی حامل ہیں......

۱۔ تذکرۂ علماء ہند : مولوی رحمٰن علی
۲۔ وصایا اربعہ : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۳۔ مآثر الامراء : شاہنواز خاں

مولانا غلام شبر صاحب صدیقی بدایونی کی کتاب ''مدائح حضور نور'' کے دوسرے حصہ کو ''تذکرۂ نوری'' کے نام سے ترتیب دیا اور اس پر ایک طویل اور وقیع مقدمہ تحریر فرمایا، اس کے علاوہ ڈھائی سو کے قریب علمی و تحقیقی مقالے اور تقریباً ۳۰ کتابوں پر مقدمات تحریر کئے، گویا اپنی ساری عمر علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کی نذر کر دی، آخر ۲۵/ نومبر ۱۹۸۳ء کو ایک کار ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے[۱]۔

☆ سخن گستری ۔

دیگر غیر جانبدار مؤرخین و محققین کی طرح ہم ڈاکٹر ایوب قادری صاحب مرحوم کے بارے میں بھی یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ ان کا تاریخی مطالعہ معروضی نوعیت کا تھا موضوعی نہیں، گروہی اور مسلکی خانوں سے اوپر اٹھ کر وہ تاریخ کا مطالعہ کرتے تھے، مستند تاریخی

---

[۱] ڈاکٹر قادری کا سوانحی خاکہ اور ان کی تصانیف و تراجم سے متعلق یہ ساری معلومات ڈاکٹر شمس بدایونی کے مقالے ''ڈاکٹر محمد ایوب قادری'' (مشمولہ ''حقائق و بصائر'' ص: ۲۹۷ تا ص: ۳۲۴، بریلی ۱۹۸۶ء) سے شکریہ کے ساتھ ماخوذ ہے۔

روایات، درایت وقرائن اور واقعات کی مخصوص ترتیب کے بعد وہ جن نتائج تک پہنچتے تھے ان کو بے کم وکاست صفحۂ قرطاس کی زینت بنا دیا کرتے تھے، اپنے اس تحقیقی منہج کی بنیاد پر انہوں نے اپنے بعض معاصرین اور متقدمین سے اختلاف رائے بھی کیا ہے، جس کا بہر حال ان کو حق حاصل تھا، زیرِ نظر رسالہ اگرچہ ان کی بالکل ابتدائی تصنیف ہے مگر اس میں بھی انہوں نے اپنے اسی تحقیقی نہج کو برتا ہے، انہوں نے صاحب تذکرہ کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور جمع شدہ معلومات کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے، یہ سلیقۂ ترتیب عموماً ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قادری مرحوم کے وسعت مطالعہ، گہری نظر اور تنقیدی بصیرت کے تمام تر اعتراف کے باوجود مستند تاریخی حوالوں اور علمی دلائل کی روشنی میں اس رسالہ میں مندرج ان کی بعض تحقیقات اور اخذ کردہ بعض نتائج سے اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے زیرِ نظر رسالہ کے صفحہ ۵۵ تا ۵۸ پر ‘‘سخن گستری’’ کے ذیلی عنوان سے جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی زمرے میں آتا ہے، ‘‘سخن گستری’’ ان کی ذاتی رائے ہے جو انہوں نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں قائم کی ہے، ضروری نہیں کہ اس سے صد فی صد اتفاق بھی کرلیا جائے۔

یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کی ‘‘سخن گستری’’ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ سخن گستری میں قادری صاحب نے دو باتیں کہی ہیں......

۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی کے خاندان والوں نے ان کے مجاہدانہ کردار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی، اور جہاد آزادی میں ان کی شرکت کا یا تو تذکرہ ہی نہیں کیا یا اگر کیا تو بڑے مبہم انداز میں، اس سلسلہ میں انہیں تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی، مولانا ضیاء القادری بدایونی اور قاضی معین الدین کیفی قادری سے حالات چھپانے کی شکایت ہے۔

۲۔ مولانا فیض احمد بدایونی کے سال وفات کا تعین نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے ۱۲۷۴ھ کو ان کا سال وفات قرار دے دیا ہے، جبکہ بعض تذکروں کی عبارت سے بادیٔ النظر میں سال وفات ۱۲۷۳ھ کا تعین ہوتا ہے۔ حالانکہ ۱۲۷۵ھ تک مولانا کا باحیات ہونا یقینی ہے۔

- اولاً ہم پہلی سخن گستری کا جائزہ لیتے ہیں......

نمبر ۱ میں جو ''سخن گسترانہ بات'' ہے وہ اگر کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہوتی جو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات، انگریزی ظلم و استبداد، سزائے موت اور حبس دوام کی گرم بازاری، مجاہدین اور ان کے خاندانوں کی کس مپرسی اور موقع شناسوں و ابن الوقتوں کی سازشوں سے ناواقف ہوتا تو چنداں حیرت کی بات نہیں تھی مگر یہ بات ڈاکٹر قادری صاحب جیسے ''دانائے راز'' کے قلم سے نکلی ہے جو یقیناً باعث حیرت ہے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر لگ بھگ ۲۰ویں صدی کی پہلی دہائی تک ہندستانیوں پر ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ایسا خوف طاری تھا کہ عموماً اس سانحہ کا تذکرہ کرنے کی جرأت نہیں کی جاتی تھی، خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ۱۸۵۷ء کے سانحہ کو جنگ آزادی یا جہاد حریت کہنے سے بھی کتراتے تھے، عموماً اس کو ''بغاوت''، ''غدر'' یا ''فساد'' کا نام دیا جاتا تھا، یہ نام اگرچہ انگریز کا دیا ہوا تھا مگر اس کو طوعاً یا کرہاً قبول کرلیا گیا تھا، زیر نظر رسالہ میں قادری مرحوم نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بانگ دہل ''جنگ آزادی'' اور ''جہاد حریت'' لکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ رسالہ ۱۸۵۷ء کے پورے سو برس بعد ایک آزاد مسلم ملک میں بیٹھ کر لکھا جا رہا ہے، ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر قادری صاحب مرحوم یہ رسالہ ۱۸۸۰ء یا ۱۹۰۰ء کے درمیان لکھ رہے ہوتے تو وہ اتنی آسانی سے اس کو جنگ آزادی یا جہاد حریت لکھنے اور کہنے کی جرأت ہرگز نہ کرتے۔ قادری صاحب نے جن کتابوں اور مقالوں کا تذکرہ کیا ہے (کہ ان میں سب سے پہلے مولانا فیض احمد بدایونی کے مجاہدانہ کردار کو اجاگر کیا گیا) ان کے بارے میں یہ بات

خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ سب کتابیں اور مقالات آزادیٔ وطن ۱۹۴۷ء کے بعد منظرِ عام پر آئے ہیں۔ مثلاً مفتی انتظام اللہ شہابی کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، ''غدر کے چند علماء'' اور مولوی محمد سلیمان بدایونی کا مقالہ ''بدایوں کا جہادِ حریت'' وغیرہ جس زمانے میں تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی ''تحفۂ فیض'' (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) اور مولانا انوار الحق عثمانی ''طوالع الانوار'' (۱۲۹۶ھ/ ۱۸۸۰ء) لکھ رہے تھے، اس وقت نہ مفتی انتظام اللہ شہابی مذکورہ دونوں کتابیں شائع کرنے کا خیال دل میں لا سکتے تھے اور نہ ہی محترم ایوب قادری صاحب زیرِ نظر رسالہ تالیف فرما کر شائع کرنے کی جرأت رندانہ کرتے۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی اکثر مشہور کتابیں آزادی کے بعد ہی تالیف وطباعت سے ہمکنار ہوئی ہیں مثلاً غلام رسول مہر کی ''سرگزشت مجاہدین'' (طبع اول ۱۹۵۶ء) اور سید محمد میاں کی ''علما ہند کا شاندار ماضی'' (طبع اول ۱۹۵۷ء) وغیرہ۔

۱۸۵۷ء کے بعد ان مجاہدین کے جہادی کارنامہ کا تذکرہ یا تو انگریز مؤرخین نے اپنی کتابوں میں کیا یا پھر ان ہندستانیوں نے کیا جو انگریزوں کو خوش کرکے امن وامان کی زندگی گزارنا چاہتے تھے، صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں ان حضرات کا تعارف قومی ہیرو کی حیثیت سے نہیں کرایا گیا تھا بلکہ ان کو فسادی اور ریاست کا باغی بنا کر پیش کیا گیا تھا۔

ہاں ڈاکٹر صاحب کی اس سخن گستری میں اس وقت کچھ وزن ہوتا جب مولانا فیض احمد بدایونی کے علاوہ باقی مجاہدین آزادی مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ کی جہاد آزادی میں شرکت، انگریزوں سے نفرت اور آزادیٔ وطن کے لئے جان ومال کی بازی لگانے کا خوب تذکرہ کیا جارہا ہوتا، ان حضرات کے کارنامۂ جہاد پر تصنیف وتالیف کا بازار گرم ہوتا، تذکرہ نویس ان کو شجاعت اور ہمت مردانہ کے تمغوں سے نواز رہے ہوتے، شعرا ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کر ان کی پامردی اور جاں سپاری کو خراج عقیدت پیش کررہے ہوتے، اور صرف

’’بے چارے مولوی فیض احمد بدایونی‘‘ کے مجاہدانہ کردار کو چھپایا جا رہا ہوتا - ایسی صورت حال میں اُن کے خاندان والوں پر ان کے حالات چھپانے کا الزام اپنے اندر کچھ وزن رکھتا۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حالات ایسے نہیں تھے، بلکہ جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں شریک تمام علماء و قائدین کی جہادی اور سیاسی خدمات کے تذکرہ سے عموماً صرف نظر کیا جاتا تھا، خود مفتی انتظام اللہ شہابی اس بات کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں:

> ’’ان میں (انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والوں میں) نمایاں شخصیت مولانا امام بخش صہبائی شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ خاں، نواب شیفتہ، مولوی عظیم اللہ کانپوری، منیر شکوہ آبادی وغیرہ تھے، مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی‘‘۔
>
> (غدر کے چند علما، ص:۳۰، دینی بکڈپو دہلی)

علامہ فضل حق خیر آبادی جو اس جہاد میں قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے[1]، اور جن کے فتویٰ پر دیگر علماء کے علاوہ خود مولانا فیض احمد بدایونی کے بھی دستخط تھے، اگر ۱۹۴۷ء سے قبل ان کے تذکروں کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ مولانا خیر آبادی کا رسالہ ’’الثورة الهندیه‘‘ اور ’’قصائد فتنته الهند‘‘ جن کو ۱۸۵۷ء کے حالات کے سلسلہ میں ایک معتبر عینی شہادت کا درجۂ استناد حاصل ہے، وہ بھی ۱۹۴۷ء سے قبل شائع نہیں کئے جا سکے جب کہ غیر منقسم ہند و پاک میں سلسلۂ خیر آباد کے ہزاروں تلامذہ اور مستفیضین درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور طباعت و اشاعت کے میدانوں میں خدمات انجام دے رہے تھے، مولانا خیر آبادی کی اکثر تصانیف مثلاً ہدیہ سعیدیہ، حاشیہ

---

[1] خیر سے اب تو ایسے محققین بھی سامنے آگئے ہیں جنھوں نے علامہ کو ’’تہمت بغاوت‘‘ سے بری کرتے ہوئے سرے سے ان کی جہاد میں شرکت و اعانت کو ہی ایک افسانہ قرار دے دیا ہے۔

قاضی مبارک، امتناع النظیر اور الروض المجود وغیرہ ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوکر منظر عام پر آگئیں، مگر ان کے اخلاف یا تلامذہ میں سے کسی نے ''الثورۃ الھندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الھند'' کی طباعت کی طرف توجہ نہیں کی، سب سے پہلے اس کو مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی نے ترجمہ کر کے مدینہ پریس بجنور سے اوائل ۱۹۴۷ء میں ''باغیٔ ہندوستاں'' کے نام سے شائع کیا۔ اس پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''تعارف'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر لکھی، اس میں مولانا آزاد لکھتے ہیں......

> ''مولانا فضل حق رحمتہ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہل علم میں متداول تھا، لیکن آج تک اس کی طباعت کا سر و سامان نہ ہو سکا، غدر ۵۷ء کی بربادیوں کے بعد لوگوں کی ہمتیں اس درجہ پست ہوگئیں تھیں کہ اس قسم کی تحریرات کی اشاعت کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا، خود مولانا کے خاندان نے اس کی اشاعت مصلحت کے خلاف سمجھی، اور جن لوگوں کے پاس اس کی نقلیں تھیں وہ بھی اس کی نمائش احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، آج ہم اس رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں پاتے جسے سیاسی حیثیت سے خطرناک تصور کیا جائے، لیکن اس زمانے کا حال دوسرا تھا۔
>
> (باغیٔ ہندوستاں: ص: ۲۳، ناشر المجمع الاسلامی مبارکپور)

باغیٔ ہندوستان کی ''تقدیم'' میں مولانا نجم الحسن خیرآبادی کا یہ اقتباس بھی قابل غور ہے:

> ''لیکن علامہ کی زندگی کا دوسرا رخ جس کا تعلق اعلاءِ کلمۂ حق سے ہے، اس کے متعلق علمی دنیا میں بھی اس سے زیادہ کسی کو علم نہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد کی پاداش میں ملک بدر کر کے آپ کو جزیرۂ انڈمان بھیج دیا گیا۔ علامہ کی زندگی کے اس رخ پر بالکل پردہ

پڑا ہوا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ پورے برصغیر پر انگریزوں کا اقتدار تھا، کسی کو لب کشائی کی گنجائش نہ تھی۔ علامہ کی حیات کا یہ درخشاں رخ باغیِ ہندوستان اور الثورۃ الہندیہ کی اشاعت سے منظر عام پر آیا، اگرچہ الثورة الهندیه کے دو چار نسخے بعض اہل علم کے پاس محفوظ تھے، لیکن ان کے اظہار سے اس وقت کا قانون مانع تھا''۔

(مرجع سابق، ص: ۸)

اس کے مترجم مولانا عبد الشاہد خاں مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مولانا عبد الحق (علامہ فضل حق کے صاحبزادے) نے بڑی محنت و کاوش سے اسے (الثورة الهندیه کو) مرتب کیا اور چند مخلصین اور معتقدین نے اس کی نقلیں حرز جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں، اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہو گئے، حکومت کے خوف سے کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش کی نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کر سکا''۔ (مرجع سابق، ص: ۱۶)

مذکورہ تینوں اقتباسات پر ہم کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

نظامی بدایونی کی ''قاموس المشاہیر'' دیکھی جائے (اہل علم نے اس پر جو استدراکات کئے ہیں ان سے قطع نظر) اس میں بھی مجاہدین آزادی ۱۸۵۷ء کے تذکرے کے ذیل میں ان کے کارنامۂ جہاد پر کچھ نہیں لکھا گیا ہے، مولانا خیر آبادی کے ذکر میں صرف اس پر اکتفا کیا گیا کہ:

''غدر کے زمانے میں انگریزوں نے ان کو رنگون یا انڈمان میں قید کر دیا وہیں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو وفات پائی''۔

(قاموس المشاہیر: ج۲، ص: ۱۱۶، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۲۰۰۴ء طبع دوم)

بلکہ مفتی صدرالدین آزردہؔ کے بارے میں جو بات نظامی بدایونی نے کہی ہے اس سے تو جنگِ آزادی میں ان کی شرکت ہی مشکوک ٹھہرتی ہے، لکھتے ہیں:

> ”۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء بزمانۂ غدر فتویٰ جہاد کے اہتمام میں جائداد ضبط ہوگئی، مگر چند ماہ کی نظر بندی اور تحقیق کے بعد رہائی ہوئی اور کچھ جائداد بھی واپس مل گئی“۔ (مرجع سابق، ج:۲/ص:۳۴)

آزردہؔ کے بارے میں یہی بات مولوی رحمٰن علی نے بھی لکھی ہے۔ (دیکھئے تذکرہ علماء ہند: ترجمہ وترتیب ڈاکٹر ایوب قادری، ص:۲۴۷، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء)

مولوی رحمٰن علی صاحب نے ۱۳۰۵ھ میں ”تذکرہ علماء ہند“ لکھنا شروع کی جو لگ بھگ ۸-۱۳۰۷ھ/ ۹۱-۱۸۹۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اس کا اصل فارسی ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ بعد میں ایوب قادری صاحب کے ترجمے، ترتیب اور ضروری حواشی کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں پاکستان سے طبع ہوئی۔ اس میں بھی (بقول ایوب قادری صاحب) ”جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے والے علما کو نظر انداز کر دیا گیا“ اور اگر ان علماء میں سے کسی کا ذکر کیا بھی گیا ہے تو ان کی جہاد آزادی میں شرکت پر ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا[1]۔

جب تمام مجاہدین آزادی کے بارے میں سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کا عمومی رویہ یہی رہا تو پھر صرف تحفۂ فیض، طوالع الانوار اور اکمل التاریخ کے مصنفین ہی کو کیوں موردِ الزام ٹھہرایا جائے؟ بات وہی ہے جو ہم نے اوپر عرض کی کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر

---

[1] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غالباً خاندان عثمانی کے تذکرہ نویسوں پر مجاہد آزادی کے حالات چھپانے کا الزام لگا کر محترم قادری صاحب جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں اس کا اظہار وہ کھل کر زیر بحث سخن گستری میں نہیں کر سکے، شاید اس لئے کہ اس رسالہ کی اشاعت کا محرک اسی خاندان کا ایک فرد تھا، چونکہ ”تذکرۂ علما ہند“ کا مقدمہ لکھتے وقت ان کے سامنے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی، لہٰذا انہوں نے تذکرۂ علما ہند کے مؤلف کے ذریعہ مجاہدین آزادی کو نظر انداز کرنے کی وجہ یہ فرض کر لی۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر……)

۲۰ رویں صدی کی پہلی دہائی تک ۱۸۵۷ء کے سرفروش مجاہدین کے حق میں ماحول ایسا سازگار نہیں تھا، کہ ان کے مجاہدانہ کارناموں پر سیمینار منعقد کئے جاتے، رسائل وجرائد کے خصوصی نمبر شائع کئے جاتے، ان کی یادگاریں قائم کی جاتیں اور سوانحی کتب میں جہاد آزادی میں شرکت پر ان کی شان میں قصائد درج کئے جاتے۔ یہ حضرات تو انگریز کی نظر میں باغی اور ریاست کے سب سے بڑے مجرم تھے ان کا تذکرہ تو خیر بہت بڑا جرم تھا ہی عمومی طور پر بھی انگریز کی کسی پالیسی پر تحریراً یا تقریراً تنقید کرنا بھی کوئی کم دل گردہ کا کام نہیں تھا، ۲۰ رویں صدی کی دوسری دہائی میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع، ۱۹۱۹ء میں خلافت موومنٹ شروع ہوا اور ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات بپا کی گئی، ان تحریکوں کے اثر سے انگریز کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ ان تمام تفصیلات کے بعد آپ ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کی سخن گستری کی یہ عبارت پڑھیں تو آپ کو پہلی نظر میں یہ احساس ہو جائے گا کہ یہ محض ''برائے وزن شعر'' لکھ دی گئی ہے، تاریخی حیثیت سے اس کا کوئی وزن نہیں۔ فرماتے ہیں......

> ''خاندانی تذکروں کے طور پر چار کتابیں تحفۂ فیض، طوالع الانوار، بوارق محمدیہ اور اکمل التاریخ شائع وطبع ہوئیں مگر افسوس کہ مولانا فیض

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ......)

''شاید اس میں ریاست کی ملازمت اور سرکار انگلشیہ سے تعلقات کی مصالح کو دخل ہو''۔ (مقدمہ تذکرہ علما ہند، ص:۲۶، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء)

ہاں البتہ جو بات وہ ''سخن گستری'' میں نہیں کہہ سکے اس کا اظہار انہوں نے ''مقدمہ حیات سید احمد شہید'' ''مولانا احسن نانوتوی'' اور اپنے کئی دیگر مقالات میں کھل کر کر دیا، انہوں نے مولانا فضل رسول بدایونی اور ان کے اخلاف وتلامذہ کو انگریز کا وظیفہ خوار اور اس کے اشارہ پر کتابیں تصنیف کر کے انگریزی حکومت کو مضبوط کرنے والا قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کرم فرمائی پر ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب ''مولانا فضل رسول بدایونی پر بعض مؤرخین کے الزامات کا تحقیقی جائزہ'' میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اسید الحق۔

احمد بدایونی کے مجاہدانہ کارناموں کو کہیں جگہ نہ ملی"۔

(رسالہ ھٰذا، ص ۵۱)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں......

"اگر چہ مفتی (انتظام اللہ شہابی) صاحب کو مکمل حالات نہ مل سکے اور کیوں کر ملتے جب کہ گھر سے اخفاء و پوشیدگی کی پوری پوری کوشش کی گئی"۔ (رسالہ ھٰذا، ص ۵۷)

ڈاکٹر ایوب قادری صاحب مرحوم نے دوسری سخن گستری مولانا فیض احمد بدایونی کے سن وفات اور گمشدگی کے سلسلہ میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں تذکرہ نگاروں میں جو اختلاف ہے اس کو قادری صاحب نے ایک "لطیفہ" قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس میں لطیفہ والی کوئی بات نہیں ہے، واقعات کی تواریخ وسنین اور شخصیات کی ولادت و وفات کے سن میں اس قسم کا اختلاف ہوتا رہتا ہے، جو شخص سوانحی ادب یا تاریخی تذکروں کو پڑھنے کا عادی ہے اس کو قدم قدم پر اس قسم کے "لطائف" کا سامنا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس سخن گستری پر کچھ عرض کرنے سے پہلے چند تمہیدی مقدمات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، جن سے غالباً ایوب قادری مرحوم کو بھی اختلاف نہ ہو۔

۱۔ جہاد آزادی کی ابتداء مئی ۱۸۵۷ء / رمضان ۱۲۷۳ھ میں ہوئی۔ مولانا فیض احمد بدایونی روز اول سے کسی نہ کسی حیثیت سے جہاد آزادی میں شریک تھے، لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ۱۲۷۳ھ میں دنیاوی علائق کو ترک کر کے اعانت دین کے لئے مردانہ وار مصروف ہوئے۔

۲۔ مجاہدین آزادی میں سے اکثر کی گرفتاری، ہجرت یا شہادت کے سلسلہ میں تاریخی ثبوت موجود ہیں، مگر مولانا فیض احمد بدایونی کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔

۳۔ مولانا کے بارے میں اتنی بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ معرکۂ محمدی میں شریک تھے، یہ معرکہ مئی/ جون ۱۸۵۸ء شوال ۱۲۷۴ھ میں پیش آیا۔ لہٰذا نتیجہ نکلا کہ مولانا فیض احمد کی حیات جون ۱۸۵۸ء/ شوال ۱۲۷۴ھ تک یقینی ہے۔

۴۔ گزشتہ تین مقدمات اور ان سے برآمد شدہ نتائج سے ایوب قادری صاحب کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اب اس کے بعد چند امکانات فرض کئے جاسکتے ہیں:

(الف) وہ اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ حجاز یا کسی اور اسلامی ملک کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں وفات پائی۔

(ب) نیپال چلے گئے۔

(ج) گرفتار ہوئے، سزائے موت یا کالا پانی کی سزا ہوئی۔

(د) ہندستان میں ہی کہیں روپوش ہو گئے اور گمنامی میں وفات ہوئی۔

(ھ) معرکۂ محمدی میں شہید ہو گئے۔

(ز) ساتھیوں کے ساتھ ہجرت تو کی مگر راستے ہی میں کہیں جاں بحق ہو گئے۔

درایت اور قرائن کی روشنی میں ان امکانات کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں......

(الف) پہلا امکان تو خود ایوب قادری صاحب کو بھی تسلیم نہیں وہ اسی رسالہ میں فرماتے ہیں:

> ''اگر مولانا فیض احمد حجاز پہنچتے تو ضرور سراغ لگتا کیوں کہ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول بدایونی نے بہت تلاش کیا اور اس سلسلہ میں ممالک اسلامیہ کا مکمل سفر کیا، قسطنطنیہ (ترکی) تک پہنچے، مگر سراغ نہ ملا''۔ (رسالہ ھٰذا، ص ۵۴)

(ب) مولانا کے متعلق مشہور ہوا کہ نیپال چلے گئے، مگر اس امکان کو بھی ڈاکٹر قادری

مرحوم نے مسترد کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''یقینی بات ہے کہ اگر مولوی فیض احمد معرکۂ محمد سے بچ گئے تو یقیناً ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ رہے''۔ (رسالہ ھٰذا، ص ۵۳-۵۴)

اور پھر ''قیصر التواریخ'' کے حوالے سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں اور شہزادہ فیروز شاہ سندیلہ، بلہور گھاٹ، مکن پور، اٹاوہ، جے پور اور بیکانیر ہوتے ہوئے دریائے اٹک اتر کر ایران میں داخل ہوئے اور وہاں سے حجاز پہنچے۔

(ج) گرفتار ہو کر سزائے موت یا کالا پانی (عبور دریاء شور) کی سزا کا امکان بھی قابل قبول نہیں ہے۔ جن جن حضرات پر مقدمات قائم ہوئے، سزائے موت ہوئی یا انڈمان میں عمر قید (حبس دوام بعبور دریاء شور) کی سزا سنائی گئی ان سب کا ریکارڈ موجود ہے، انگریز مؤرخین اور ہندوستانی تذکرہ نگاروں نے بھی اکثر کا ذکر کیا ہے، مولانا فیض احمد عام آدمی نہ تھے بلکہ ''باغیوں کے سرغنہ'' اور ''غدر'' بپا کرنے والوں میں سے تھے لہٰذا اگر ان کی گرفتاری اور مقدمہ وغیرہ کی نوبت آئی ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کا تذکرہ انگریزی تاریخ یا ہندوستانی تذکروں میں کہیں بھی نہ ہو۔

(د) ہندوستان میں کہیں روپوش ہونے کا امکان بھی بعید از قیاس ہے کیوں کہ انگریزوں کے ایجنٹ مجاہدین کی بو سونگھتے پھر رہے تھے، مخبر انعام و اکرام کے لالچ میں ''باغیوں'' کی تلاش میں چپہ چپہ چھان رہے تھے، ایسے حالات میں کسی ایسے شخص کا زیادہ دنوں تک روپوش رہ پانا قرین قیاس نہیں ہے، جس نے جہاد آزادی میں تقریراً، تحریراً اور عملاً ہر طرح حصہ لیا ہو۔

اب صرف دو امکان باقی رہتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو ہمیں اختیار کرنا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے حق میں کوئی داخلی شہادت نہیں ہے لہٰذا لامحالہ ہمیں قیاس اور قرائن سے کام لینا ہوگا۔

(د) مولانا معرکہ محمد میں شہید ہو گئے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''اس کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں''۔ مگر اس کے باوجود وہ اس سلسلہ میں تذبذب کا شکار ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں...... ''اگر مولوی فیض احمد معرکہ محمدی سے بچ گئے تو......'' ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ''اگر مولانا فیض احمد معرکہ محمدی میں شہید نہ ہوئے تو......'' لہٰذا معرکہ محمدی میں مولانا کی شہادت کا دعویٰ اگر بے ثبوت ہے تو یقینی طور پر یہ دعویٰ بھی بے ثبوت ہے کہ وہ بچ کر چلے گئے تھے اور پھر جتنا اس بات کا امکان ہے کہ وہ بچ کر چلے گئے تھے اتنا ہی امکان اس کا بھی ہے کہ وہ معرکہ محمدی میں شہید ہو گئے ہوں۔

(ھ) مولانا اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ معرکہ محمدی سے بچ کر نکلے مگر حجاز پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں کہیں جاں بحق ہو گئے۔ ڈاکٹر قادری مرحوم نے ''قیصر التواریخ'' کا جو حوالہ دیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں اور شہزادہ فیروز شاہ کو سندیلہ سے لے کر راجپوتانہ تک کے سفر میں کئی جگہ معرکے پیش آئے، عین ممکن ہے کہ مولانا بدایونی نے ان معرکوں میں سے کسی معرکے میں جام شہادت نوش فرمایا ہو۔ ہمارے ناقص خیال میں ان تمام امکانات میں یہ امکان نسبتاً زیادہ قوی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ان تمہیدی مقدمات کے بعد ہم ڈاکٹر قادری صاحب کی سخن گستری (یا انہیں کے الفاظ میں ''لطیفے'') کا جائزہ لیتے ہیں......

ڈاکٹر صاحب نے مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی کی طوالع الانوار سے جو عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

> ''سن ۱۲۷۳ھ میں تائید دین متین میں للہ فی اللہ مردانہ دولت دنیا کو پیٹھ دے کر مصروف ہوئے جب سے آج تک کچھ حال معلوم نہیں ہوا''۔
>
> (طوالع الانوار، ص: ۲۳، مطبع صبح صادق سیتاپور، ۹۷-۱۲۹۶ھ)

ڈاکٹر صاحب نے مولانا ضیاء القادری کی اکمل التاریخ سے جو عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

> ''آپ نے زمانہ غدر میں آگرہ ہی سے جب کہ ہر طرف ہنگامہ جدال و

قتال گرم تھا، ترک علائق کر کے راہ حق میں قدم رکھا اور جادۂ فنا تک پہنچ کر بقائے جاودانی کا لطف اٹھایا کسی کو آپ کا پتہ نہ چلا کہ کہاں تشریف لے گئے"۔ (اکمل التاریخ، ج:۱/ص:۶۲، مطبع قادری بدایوں ۱۳۳۴ھ)

(یہی وہ عبارت ہے جس میں قادری صاحب کو مولانا فیض احمد بدایونی کے بارے میں "مبہم" لہجہ اختیار کرنے کا شکوہ ہے، اس پر ہم گزشتہ صفحات میں روشنی ڈال چکے ہیں)

وفات اور گمشدگی کے سلسہ میں جو مقدمات ہم نے عرض کئے تھے ان سے معلوم ہوا تھا کہ مئی ۱۸۵۷ء/ رمضان ۱۲۷۳ھ کو معرکہ کا آغاز ہوا، اور مولانا فیض احمد ابتداء ہی سے اس میں شریک تھے، لہذا صاحب "طوالع الانوار" کا یہ لکھنا کہ "۱۲۷۳ھ میں تائید دین میں مصروف ہوئے" بالکل درست ہے، اسی طرح صاحب اکمل التاریخ کا یہ لکھنا بھی بالکل بے غبار ہے کہ "زمانۂ غدر میں ترک علائق کر کے راہ حق میں قدم رکھا"۔ ان دونوں عبارتوں پر ڈاکٹر صاحب کو اس پہلو سے اعتراض بھی نہیں ہے، سخن گستری کا تعلق ان کے اس جملہ سے ہے:

> ـمگر تحفۂ فیض کی عبارت سے بادیٔ النظر میں سن وفات کا تعین ہوتا ہے الفاظ ملاحظہ فرمائیے "در ۱۲۷۳ھ اعانت دین متین بر جان و مال خود مقدم فہمیدند و فی سبیل اللہ جان خود را وقف گردانیدند"۔ (رسالہ ھذا، ص ۵۶)

تحفۂ فیض کی یہی عبارت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ایک صفحہ قبل بھی نقل کی ہے، اور وہاں پوری عبارت نقل کی ہے ہمیں افسوس ہے کہ یہاں ڈاکٹر صاحب نے عبارت کے اول و آخر سے ایک ایک جملہ حذف کر دیا جس کی وجہ سے انہیں بادیٔ النظر میں سن وفات کے تعین کا شبہ ہوا، تحفۂ فیض کی پوری عبارت اس طرح ہے:

> آخر در سنہ یک ہزار و دوصد و ہفتاد و سہ ترک علائق دنیا و یہ نمودہ اعانت دین متین بر جان و مال خود مقدم فہمیدند، و فی سبیل اللہ جان خود را وقف گردانیدند و بحیات سرمدی و نعیم ابدی فائز شدند۔

(تحفۂ فیض، ص: ۷، فخر المطابع میرٹھ)

ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم فارسی زبان و ادب پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے، فارسی دانی میں ہم ان کی ہمسری کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے ہاں البتہ فارسی کی تھوڑی بہت شد بد ضرور رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں مذکورہ عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہوگا......

> آخر کار سن ۱۲۷۳ھ میں دنیاوی علائق کو ترک کر کے دین متین کی اعانت کو اپنی جان و مال پر فوقیت دی اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کو وقف کر دیا اور ابدی زندگی اور دائمی عیش و آرام پا لیا۔

اس عبارت میں تین مستقل جملے ہیں:

۱۔ آخر کار ۱۲۷۳ھ میں دنیاوی علائق کو ترک کر کے دین متین کی اعانت کو اپنی جان و مال پر فوقیت دی۔

۲۔ اللہ کی راہ میں اپنی جان کو وقف کر دیا۔

۳۔ ابدی زندگی اور دائمی عیش و آرام پا لیا۔

پہلے دو جملوں میں وفات کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، ”علائق دنیا ترک کر کے دین کی اعانت کو اپنی جان پر فوقیت دینا اور جان کو اللہ کی راہ میں وقف کر دینا“ یہ دونوں باتیں بادیٔ النظر اور امعانِ نظر ہر طرح صرف اسی مفہوم کو ظاہر کر رہی ہیں جو صاحب طوالع الانوار کی عبارت سے ظاہر ہے۔ ہاں البتہ تیسرے جملے سے وفات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ عبارت کے اس تحلیلی تجزیہ کے بعد آپ غور کریں تو ظاہر ہوگا کہ ”آخر در ۱۲۷۳ھ“ (آخر کار ۱۲۷۳ھ میں) کا تعلق صرف پہلے جملے سے ہے، دوسرے اور تیسرے جملے سے نہیں، اس بات کو اگر فارسی گرامر کی اصطلاحی زبان میں کہا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ تینوں جملوں کے درمیان میں جو ”واو“ ہے وہ ”واوِ عاطفہ“ نہیں ہے بلکہ ”واو مستانفہ“ ہے۔ اگر یہاں ”واو عاطفہ“ ہوتی تو البتہ کہا جا سکتا تھا کہ ”آخر در ۱۲۷۳ھ“ کا تعلق تینوں جملوں سے ہے۔ اس تشریح کے بعد عبارت کا مطلب واضح ہے کہ صاحب تحفۂ فیض ۱۲۷۳ھ کو ترک

علائق کا سال قرار دے رہے ہیں نہ کہ ابدی زندگی اور دائمی عیش و آرام پانے کا سال۔ پھر یہاں ایک غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ مولانا عبدالقادر بدایونی ۱۲۷۳ھ کو مولانا فیض احمد کا سال وفات کیسے قرار دے سکتے تھے، کیوں کہ اگر ان کے خیال میں ۱۲۷۳ھ میں مولانا فیض احمد بدایونی کی وفات ہوگئی تھی تو پھر ان کے والد مولانا فضل رسول بدایونی کا حجاز اور قسطنطنیہ کا طویل سفر کر کے مولانا فیض احمد کی تلاش میں سرگرداں رہنا عبث ٹھہرتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ بیٹے کو ۱۲۷۳ھ میں مولانا فیض احمد کی وفات کا یقین ہو اور والد محترم اس سے ناواقف ہوں، لہٰذا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مولانا فضل رسول بدایونی کو ۱۲۷۳ھ میں مولانا فیض احمد کی وفات کا یقین نہیں تھا (ورنہ وہ سفر کیوں کرتے) اسی طرح مولانا عبدالقادر بدایونی کو بھی ۱۲۷۳ھ میں ان کی وفات پر یقین نہیں تھا ہاں البتہ یہ بات انہیں قطعی طور پر معلوم تھی کہ ۱۲۷۳ھ میں مولانا فیض احمد اللہ کی راہ میں دین متین کی اعانت کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے، اور اسی بات کا اظہار انھوں نے زیر بحث عبارت کے پہلے جملے میں کیا ہے۔

تحفۂ فیض کی عبارت کے بعد ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم قاضی معین الدین میرٹھی اور مولوی رحمٰن علی (مؤلف تذکرہ علما ہند) کی عبارتوں پر تبصرہ فرماتے ہیں……

> ”بوارق محمدیہ کی عبارت میں اس کو بالکل صاف کر کے سن وفات کا تعین بھی کر دیا گیا جیسا کہ ”درسنہ دوازدہ صد و ہفتاد و چہار راہی جنت گردید“ سے ظاہر ہوتا ہے، تذکرہ علما ہند مؤلفہ رحمٰن علی میں تو اعانت دین متین کا ذکر چھوڑ کر صاف صاف لکھا گیا کہ ”درحدود سال دوازدہ صد و ہفتاد و چہار ہجری رحلت فرمود“ حالانکہ تاریخ وفات کا تعین کسی طرح نہیں کیا جا سکتا“۔ (رسالہ ھذا، ص ۵۶)

ہمیں ڈاکٹر قادری مرحوم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ قاضی معین الدین میرٹھی اور رحمٰن علی دونوں کی مذکورہ عبارتوں میں ۱۲۷۴ھ کو متعین طور پر مولانا فیض احمد کا سن وفات قرار

دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں تین باتیں قابل لحاظ ہیں......

۱۔ تذکرہ علما ہند مؤلفہ مولوی رحمٰن علی کا ذکر کر کے ڈاکٹر صاحب حاشیہ میں یہ لکھنا نہیں بھولے کہ......

> ''بدایونی علماء کے تراجم کے لئے مولانا عبدالقادر بدایونی نے مؤلف ''تذکرہ علمائے ہند'' کو مواد بہم پہنچایا''۔ (رسالہ ھٰذا، ص ۵۶)

شکر ہے کہ قادری مرحوم نے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ مولانا فیض احمد بدایونی کا سن وفات ۱۲۷۴ھ مولوی رحمان علی کو مولانا عبدالقادر بدایونی نے بتایا تھا۔ وہ یہ نتیجہ نکال بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو ''تحفۂ فیض'' کی عبارت پر ان کی سخن گستری کا مقدمہ کمزور ہو جاتا، کیوں کہ یہ بات نا قابل تسلیم ہے کہ مولانا عبدالقادر بدایونی خود اپنی کتاب میں تو مولانا فیض احمد کا سن وفات ۱۲۷۳ھ متعین کر دیں اور مؤلف تذکرہ علماء ہند کو سن وفات ۱۲۷۴ھ بتائیں، پھر ''تحفۂ فیض'' اور ''تذکرۂ علماء ہند'' کے وقت تالیف میں اتنا زیادہ تفاوت بھی نہیں ہے کہ ذہول ونسیان کے احتمال کو تسلیم کر لیا جائے۔ ''تحفۂ فیض'' ۱۳۰۴ھ میں تالیف کی گئی اور تذکرہ علماء ہند کی تالیف کا آغاز ٹھیک اگلے سال ۱۳۰۵ھ میں ہو گیا ہے جو ۸-۱۳۰۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، ایک دو سال کا عرصہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہوتا کہ مولانا عبدالقادر بدایونی جیسا علامۂ وقت اپنی لکھی ہوئی بات ہی بھول جائے۔

۲۔ ہم تمہیدی مقدمات میں عرض کر چکے ہیں کہ ۱۲۷۴ھ (معرکۂ محمدی) میں مولانا فیض احمد بدایونی کی وفات کا دعویٰ اگر بے ثبوت ہے تو اس دعوے کو رد کر کے یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ۱۲۷۴ھ (معرکۂ محمدی) میں فوت نہیں ہوئے تھے اتنا ہی بے ثبوت ہے، ہاں جب تک مستند تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت نہیں کر دی جاتی کہ ۱۲۷۴ھ کے بعد بھی مولانا فیض احمد باحیات تھے اس وقت تک بہر حال اس کا امکان قائم ہے کہ وہ ۱۲۷۴ھ (معرکۂ محمدی) میں شہید ہو گئے ہوں اس امکان کو سرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا، پھر معرکۂ محمدی کے بعد سارے زمانے میں تلاش کرنے کے باوجود بھی مولانا کا کوئی سراغ

نہیں ملا اس پہلو کو دیکھتے ہوئے اگر قاضی معین الدین اور مولوی رحمٰن علی نے یہ قیاس کر لیا کہ وہ اسی معرکہ (۱۲۷۴ھ) میں شہید ہو گئے تو کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں کر دیا جو نا قابل معافی ہو۔ تاریخ کی بہت ساری پیچیدہ گتھیاں اسی قسم کے ”گمان غالب“، ”ظن وتخمین“، ”قرینہ و قیاس“ اور ”بالفرض“ جیسے غیر یقینی سہاروں کے ذریعہ حل کی گئی ہیں۔

۳۔ ۱۲۷۴ھ میں وفات کے دعوے کو ڈاکٹر ایوب قادری صاحب نے جس دلیل سے باطل کیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

”اگر مولانا فیض احمد معرکۂ محمدی میں شہید نہ ہوئے جس کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں تو ان کی حیات ۱۲۷۵ھ تک یقینی ہے“۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ ۱۲۷۵ھ تک مولانا کے باحیات ہونے کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔ زیر نظر رسالہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے معرکۂ محمدی کی کچھ تفصیلات تحریر فرمائی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”معرکہ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا، ۵؍جون کو مولانا احمد اللہ مدراسی شہید کر دیئے گئے اور محمدی کی اسلامی حکومت کا سقوط ہو گیا“۔ ۵؍جون ۱۸۵۸ء کو ۲۳؍شوال ۱۲۷۴ھ تھی۔ گویا ابھی ۱۲۷۵ھ کے آغاز میں ۲ ماہ سے زیادہ کا عرصہ باقی تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر مولانا بدایونی اس معرکہ میں شہید نہ ہوئے ہوں تو وہ بقول قادری صاحب ”یقینی طور پر ڈاکٹر وزیر خاں اور شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ روانہ ہو گئے ہوں گے“۔ قادری صاحب نے قیصر التواریخ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ”شہزادہ شاہ احمد اللہ شاہ کی وفات کے بعد سندیلہ پہنچا کئی جگہ مقابلہ ہوا آخر میں ۴ سو سوار رجمنٹ ۱۲ مع ظریف خاں رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خاں باقی سوار جنگی متفرق قریب ہزار کے جمع ہو کر باڑی روانہ ہوئے“۔ اب قادری صاحب کی بیان کردہ ان سب باتوں کو اس ترتیب سے دیکھیں کہ اگر مولانا فیض احمد معرکۂ محمدی میں بچ گئے تو وہ ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ رہے، یہ سفر شوال ۱۲۷۴ھ میں شروع ہوا مختلف جگہ ہوتے ہوئے سندیلہ میں فیروز شاہ کے ساتھ قریب ہزار کے جمع ہو کر باڑی کی طرف روانہ ہوئے، جبکہ اس درمیان مسلسل معرکہ بھی پیش آتے رہے، ان تمام واقعات کو

اگر آپ ایک سے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ بھی دیتے ہیں تو بھی یہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ ہی ہوتا ہے یعنی اب بھی ۱۲۷۵ھ شروع ہونے میں ایک مہینہ باقی ہے۔ اب کیا اس بات کا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس ارڈیڑھ مہینہ میں اس طویل سفر کے دوران کئی جگہ مقابلوں کے باوجود مولانا یقینی طور پر باحیات رہے؟ کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ وہ انہیں مقابلوں میں سے کسی میں شہید ہو گئے ہوں؟ بظاہر ایسی کوئی شہادت نہیں ہے جو اس امکان کو خارج کر دے، اگر اس بات امکان ہے (اور یقیناً ہے) کہ وہ ان مقابلوں میں سے کسی میں شہید ہو گئے تو پھر ۱۲۷۵ھ تک ان کی حیات کو یقینی کیسے کہا جا سکتا ہے، بات دراصل وہی ہے کہ اگر قاضی معین الدین میرٹھی اور مولوی رحمٰن علی کا یہ دعویٰ بے ثبوت ہے کہ مولانا فیض احمد ۱۲۷۴ھ میں وفات پا گئے تو یہ بات بھی اپنے پیچھے کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت نہیں رکھتی کہ "ان کی حیات ۱۲۷۵ھ تک یقینی ہے" ہاں اگر معرکہ محمدی ۱۲۷۴ھ کی بجائے ۱۲۷۵ھ میں ہوا ہوتا (جس کا کوئی ثبوت نہیں) تو میرٹھی اور رحمٰن علی کے (۱۲۷۴ھ میں وفات) دعویٰ کو مسترد کر کے قادری صاحب کے (۱۲۷۵ھ تک حیات یقینی ہونا) دعویٰ کو درست قرار دیا جا سکتا تھا۔

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ہماری ان معروضات کو دیکھنے اور اپنی سخن گستری کا دفاع کرنے کے لئے آج ایوب قادری صاحب مرحوم اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ تاہم ہمارا ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ ہم نے یہ گزارشات نیک نیتی کے ساتھ دلائل کی روشنی میں کی ہیں، خدانخواستہ ڈاکٹر قادری مرحوم کی ذات پر حملہ یا ان کے متعلقین کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی وفات یافتہ شخص کی رائے سے اختلاف یا اس کی تحقیق پر تنقید کوئی جرم ہوتا تو قادری مرحوم مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا انوار الحق بدایونی، قاضی معین الدین کیفی اور مولوی رحمٰن علی کی عبارتوں پر تنقید کر کے اس جرم کے ہرگز مرتکب نہ ہوتے، جس وقت ڈاکٹر صاحب زیر نظر رسالہ میں ان حضرات کی عبارتوں پر سخن گستری قلم بند فرما رہے تھے اس وقت یہ چاروں حضرات پردہ فرما چکے تھے۔

ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا

تجعل فی قلوبنا غلاللذین آمنوا ۔ (سورۂ حشر، آیت ۱۰)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ۔

مولانا فیض احمد بدایونی کے خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے میں ڈاکٹر ایوب قادری صاحب کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس رسالہ کے ذریعہ علمی حلقوں میں مولانا فیض احمد بدایونی کے مجاہدانہ کارناموں کا تعارف پیش کیا۔ آج ان کا یہ رسالہ مولانا فیض احمد کی حیات کے سلسلہ میں ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

☆ استدراک ۔

ڈاکٹر ایوب قادری کی طرح ان کے رسالہ کا پایہ بھی مسلم ہے، تاہم رسالہ میں بعض جگہ کچھ تاریخی تسامحات راہ پا گئے ہیں، لیکن ایسے معمولی تسامحات سے محقق کی دیگر تحقیقات کے استناد و اعتبار پر حرف نہیں آتا۔ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم نے رسالہ میں لکھا ہے کہ......

> ”مولانا فیض احمد بدایونی کو ان کے ماموں مولانا فضل رسول کی صاحبزادی منسوب تھیں، جن سے صرف ایک صاحبزادے مولانا حکیم سراج الحق تھے“۔

یہ بات درست نہیں ہے، مولانا فیض احمد بدایونی کی شادی مولانا فضل رسول بدایونی کے چچا مولانا محمد شفیع عثمانی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، البتہ مولانا فیض احمد کے صاحبزادے حکیم سراج الحق کو مولانا فضل رسول کی صاحبزادی منسوب تھیں۔

آخر میں مَیں محبّ گرامی مولانا خوشتر نورانی مدیر اعلیٰ ماہنامہ جام نور دہلی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جن کے توجہ دلانے پر رسالہ کی جدید اشاعت اور اس پر مقدمہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

اسید الحق محمد عاصم قادری

پیش لفظ

حضرت الحاج مولانا مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری البدایونی دام ظلہم العالی

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ عام طور سے اقدار پر مرتب نہیں ہوئی اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ تو خاص طور سے مسخ کی گئی۔ اس انقلاب کو انگریزوں نے صرف سپاہیوں کی ایک غیر منظّم سازش اور بغاوت سے تعبیر کر کے اہالیان برصغیر کو ظالم، جابر، لٹیرا، باغی، مذہبی دیوانہ اور غیر مہذب ٹھہرایا اور خود کو رحم دل، مہربان، محافظ، عادل، بردبار اور تہذیب یافتہ قرار دیا اور اس طرح اس منظّم اور ہمہ گیر تحریک کو بدنام کیا گیا۔ جس میں اگر ایک طرف امراء و روساء، سپاہ و فوج کے ساتھ پیش پیش تھے تو دوسری جانب علماء و فقراء اور شعراء بھی عوام کے ساتھ غیر ملکی اقتدار سے ملک و قوم کو آزاد کرانے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔

کس کو معلوم تھا کہ پوری ایک صدی کے بعد اس انقلاب ۱۸۵۷ء کی مکمل اور مفصل تاریخ مرتب کی جائے گی اور اس وقت ان مجاہدوں اور سپاہیوں کے حالات کی تلاش ہوگی جن کی مجاہدانہ سرگرمیاں مصلحت وقت کی نذر ہو گئیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بلند پایہ سہ ماہی علمی مجلّہ ”العلم“ میں اسی تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک ممتاز مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی رحمتہ اللہ علیہ کے

حالات پر مشتمل عزیزی محمد ایوب قادری بی اے سلمہم اللہ تعالیٰ کا ایک گراں قدر مقالہ شائع ہوا جو نہ صرف پاکستان کے علمی حلقوں میں پسند کیا گیا بلکہ ہندوستان کے مشہور مؤقر روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی نے بھی اس کو اپنی مسلسل دو اشاعتوں میں شائع کیا۔

بدایوں کے اسی عثمانی خاندان کے ایک ممتاز رکن صاحبزادہ مولوی عبدالمجید اقبال میاں دامت برکاتہم نے اس مقالہ کو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کی سب سے پہلے ضرورت محسوس کی اور فاضل مقالہ نگار کو اس پر آمادہ کیا۔ اب یہ مقالہ بعد نظر ثانی کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

آخر میں ہم صاحبزادہ اقبال میاں دام ظلہم العالی سے درخواست کرتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے اس مقالہ کی اشاعت کی طرف توجہ فرمائی ہے اسی طرح وہ اپنے اکابر کی دوسری تصانیف کو بھی شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرینگے۔

فقیر ضیاء القادری البدایونی غفر اللہ لہ

۲۴/ مارچ ۱۹۵۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا فیض احمد بدایونی رحمتہ اللہ علیہ

قوموں کی زندگی میں بعض واقعات بڑے دوررس نتائج کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا ذکر بسا اوقات مردہ قوتوں کے احیاء کا سبب ہوتا ہے۔ مگر ہماری تاریخ میں غیر ملکی اقتدار کی وجہ سے نہ صرف واقعات سے چشم پوشی کی گئی بلکہ مصلحت وقت سے بعض واقعات کو اس طرح پیش کیا گیا کہ صورت ہی مسخ ہوگئی اور تاریخ کی ترتیب بڑے غلط طریقہ پر ہوئی۔ اب جبکہ انگریز کا منحوس قدم جا چکا ہے تو ایسی کوشش ہونی چاہیے کہ تاریخی حقائق اپنے اصلی خدو خال میں مرتب ہوں اور ایسے اثرات جو غلط تاریخ نویسی کی وجہ سے ہمارے دماغوں میں سما گئے ہیں، صحیح واقعات لکھ کر ان کو زائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور آئندہ نسلوں کے لئے اسلاف کی تاریخ کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جائے جس کے مطالعہ سے قوم میں اپنی شاندار روایات کو قائم رکھنے کا جذبہ اور قوت عمل پیدا ہو۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات صحیح طور سے مرتب نہیں ہوئے۔ انگریز کے ڈر کی وجہ سے مجاہدین کی کوششوں کو خاص طور سے چھپایا گیا اور ان کے تعلق سے براءت ظاہر کی گئی۔ اب قیام پاکستان کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تاریخ کی ترتیب و تدوین پھر نئے سرے سے ہو رہی ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے سلسلے میں مجاہدین کے کارناموں کی تلاش ہو رہی ہے۔ ان کی کوششوں کو سراہا جا رہا ہے، ان کی قربانیوں کی بنا پر ان کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے بعض اس کو ‘‘لاحاصل’’ سمجھیں لیکن حقیقت

میں اسی جذبہ پر قومی عز و وقار کی ٹھوس بنیاد قائم ہے۔

ان سطور کو عنوانِ تمہید بناتے ہوئے یہاں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک بہادر اور جانباز مجاہد مولانا فیض احمد بدایونیؒ کا ذکر کرنا مقصود ہے جنھوں نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لے کر ملک وقوم پر اپنی جان فدا کر دی اور بقائے دوام حاصل کی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(حضرت مظہر جانِ جاناںؒ)

خاندان :- مولانا فیض احمد کا تعلق بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا۔ نامور خاندان کے بزرگ محمد دانیال قطری لاہور و دیوبند ہوتے ہوئے عہد شمسی میں بدایوں آ کر عہدۂ قضاء پر متمکن ہوئے۔ اس خاندان میں ہر زمانہ میں نامی گرامی عالم و فاضل پیدا ہوئے جنھوں نے عہدۂ افتاء وقضاء کو زینت بخشی ہے۔ قاضی رکن الدین (المقتول ۶۳۸ھ-۱۲۴۰ء) قاضی سعد الدین المعروف بہ قاضی سعد بے گواہ (المتوفی ۶۷۷ھ-۱۲۸۸ء) مولوی مرید محمد (المتوفی ۱۰۹۹ھ-۱۶۸۷ء) مفتی عبدالغنی (المتوفی ۱۲۰۱ھ-۱۷۹۴ء) بحر العلوم مولانا محمد علی (المتوفی ۱۱۹۷ھ-۱۷۸۲ء) مفتی محمد عیوض بدایونی ثم بریلوی؛ مولانا عبدالمجید (المتوفی ۱۲۶۳ھ-۱۸۴۶ء) مولانا فضل رسول (المتوفی ۱۲۸۹ھ-۱۸۷۲ء) مولانا عبدالقادر (المتوفی ۱۳۱۹ھ-۱۹۰۱ء) مولانا عبدالمقتدر (المتوفی ۱۳۳۴ھ-۱۹۱۹ء) مولانا حکیم عبدالقیوم (المتوفی ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء) اور مولوی حکیم عبدالماجد (المتوفی ۱۳۵۰ھ-۱۹۳۱ء) وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے عہد میں اس خاندان کی نامور ہستیاں گذری ہیں۔

مولانا فیض احمد کے بزرگوں میں مولوی مرید محمد بن ملا عبدالشکور نے عہد عالمگیری میں قوم نانگہ سے زبردست جہاد کیا جبکہ انھوں نے سورج کنڈ (بدایوں) کے مقام پر عہدِ غزنوی کی تعمیر شدہ ایک مسجد کو شہید کر دیا تھا۔ مولوی مرید محمد نے اپنے مدرسہ کے طلباء نیز دوسرے

لوگوں کے ہمراہ موقع پر پہنچ کر مفسدین کو کیفر کردار کو پہنچایا اور مسجد کو دوبارہ تعمیر کرادیا[1]۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آریہ سماج نے اس مقام پر گروکل تعمیر کیا۔ مسلمانانِ محلّہ نئی سرائے (بدایوں) نے اس مسمار شدہ مسجد کے قیام و تحفظ کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر ایک مسلم منصف ''مرزا قسیم بیگ چغتائی'' کے فیصلہ سے یہ مسجد ہمیشہ کے لئے اس مقام سے ختم ہوگئی۔

اسی طرح مفتی محمد عیوض بن مفتی درویش محمد بدایونی، مفتی بریلی نے سب سے پہلے روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے ۱۲۳۲ھ-۱۸۱۶ء میں جہاد کیا۔ مفتی محمد عیوض کی قیادت میں بہت قلیل عرصہ میں پیلی بھیت، رامپور، آنولہ، سرولی، شیر گڑھ اور شاہجہاں پور سے قریب پانچ ہزار سے متجاوز مجاہدین جمع ہوگئے۔ میدان شہر کہنہ متصل زیارت حضرت شاہ دانا ولی رحمتہ اللہ علیہ میں معرکہ عظیم ہوا۔ اوّل مجاہدین کا پلّہ بھاری رہا۔ آخر میں انگریزوں کی مراد آباد سے نئی تازہ دم فوج پہنچ گئی اور انگریز کامیاب ہوئے۔ مفتی محمد عیوض دوسرے سر برآوردہ حضرات کے ساتھ ٹونک تشریف لے گئے۔ نواب امیر خاں والئ ریاست نے بڑی قدر و منزلت فرمائی اور وہیں مفتی صاحب کا انتقال ہوا۔ غرض یہ حریت و آزادی کے اثرات تھے[2]۔

مولانا فیض احمد کے پر دادا بحر العلوم مولانا محمد علی عالم اجل و فاضل بے بدل تھے مولانا قاضی مستعد خاں دہلوی اور قاضی مبارک گوپاموی (المتوفی ۱۱۶۲ھ - ۱۷۴۸ء) سے علم منقول و معقول حاصل کیا۔ دہلی و بدایوں میں ایک مدّت تک درس دیا۔ نواب آصف الدولہ نے چند قطعات آراضی اور موضع شادی پور کی سند دی جس پر مولانا فیض احمد کے صاحبزادے حکیم سراج الحق کے زمانہ تک عمل رہا[3]۔ مسجد خرما و مدرسہ قادریہ کی مرمت و تعمیر

---

[1] اکمل التاریخ حصہ اوّل در خطبۂ صدارت مدرسہ قادریہ مرتبہ شیخ احترام الدین رئیس شیخوپور۔

[2] مفتی محمد عیوضؒ کے متعلق راقم کا ایک تفصیلی مقالہ العلم کراچی اپریل ۵۵ء میں شائع ہوا ہے۔

[3] اکمل التاریخ جلد اوّل۔

کرائی۔ ۱۱۹۷ھ-۱۷۸۲ء میں انتقال کیا۔ مولانا بحر العلوم کا وصال لکھنؤ میں ہوا۔ جنازہ بدایوں لایا گیا، عیدگاہ شمسی بدایوں جانب شمال دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولوی شمس الدین (مولانا فیض احمد کے دادا) فقہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ کو بھی معافیات و آراضیات کی سندات نوابان اودھ وغیرہ سے حاصل تھیں[۱]۔ شرح وقایہ پر آپ نے حاشیہ لکھا۔ ۱۱۹۶ھ-۱۷۸۱ء میں اپنے والد کے سامنے انتقال کیا۔ مولانا شمس الدین کے صاحبزادے مولانا حکیم غلام احمد نے (مولانا فیض احمد کے والد) علم منقول و معقول علمائے بدایوں سے حاصل کیا اور اس کے ساتھ فن طب میں کمال حاصل تھا۔ ہزاروں مریض آپ سے شفا پاتے تھے۔ بڑے خوشنویس اور تیر انداز تھے۔ نواب ڈھاکہ کے یہاں مرشد آباد میں ملازم تھے اور وہیں ۵/ذی الحجہ ۱۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔ ملفوظات معینی میں آپ کے متعلق تحریر ہے[۲]۔

''مولوی غلام احمد فاضل و حکیم و حافظ و خوشنویس و تیر انداز بود''

مولانا فیض احمد کے نانا حضرت مولانا عبد المجید فاضل زمانہ و عالم یگانہ تھے۔ بحر العلوم مولانا محمد علی و مفتی عبد الغنی سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور پھر ملک العلما مولانا نظام الدین سہالوی بانی سلسلہ نظامیہ کے شاگرد مولانا ذو الفقار علی ساکن دیوہ سے علوم منقول و معقول، حاصل کیے اور حضرت اچھے میاں مارہروی (المتوفی ۱۲۳۵ھ-۱۸۱۹ء) سے اجازت و خلافت تھی۔ ۱۲۶۳ھ-۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ مولانا فیض احمد کے ماموں مولانا فضل رسول ابن مولانا عبد المجید بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ مولانا نور الحق فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۸ھ-۱۸۲۲ء) حکیم ببر علی خاں موہانی، شیخ عبد اللہ مکی، شیخ عابد مدنی (المتوفی ۱۲۵۷ھ-۱۸۴۱ء) وغیرہ سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل فرمائی۔ کچھ دنوں سر رشتہ دار عدالت بدایوں رہے۔ آپ کو ''ردّ وہابیت'' میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں سیف الجبار اور

۲،۱۔ اکمل التاریخ جلد اوّل

بوارق محمدیہ خاص طور سے مشہور ہیں۔ آپ کے تلامذہ کا سلسلہ وسیع ہے۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی خرم علی بلہوری، مولوی عنایت رسول چریاکوٹی، مولوی سخاوت علی جونپوری، مولوی عبدالفتاح گلشن آبادی اور مولوی فیض احمد بدایونی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انتقال ۱۲۸۹ھ-۱۸۷۲ء میں ہوا[۱]۔

پیدائش :- مولانا فیض احمد بن حکیم غلام احمد مولوی محلہ شہر بدایوں میں ۱۲۲۳ھ-۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ خدا کی قدرت کہ آپ کی عمر قریب تین سال کے ہوگی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور یتیمی کا داغ لگا۔ مگر آفریں آپ کی والدہ کو جنھوں نے آپ کی تربیت باحسن وجوہ فرمائی کیوں نہ ہو آخر ایک عالم وشیخ کی بیٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت :- مولانا کو قدرت نے شروع ہی سے وہ دل و دماغ بخشا تھا کہ جس پر آپ کے ہم درس طلباء کو رشک آتا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یاد ہوگئی اور ایک مرتبہ نظر سے گذر گئی دل پر نقش ہوگیا۔ تحقیق و تدقیق آپ کا حصہ تھا۔ اہل خاندان خیال کرتے تھے کہ مستقبل قریب میں یہ بچہ فخر خاندان ہوگا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

والدہ نے اس ہونہار بچے کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا۔ آپ نے نہایت محبت اور ناز و نعم سے پرورش فرمائی۔ مولانا فیض احمد نے تمام علوم منقول و معقول اپنے ماموں اور شفیق استاد مولانا فضل رسولؒ سے صرف چودہ سال کی عمر میں حاصل فرمائے اور پندرہویں سالگرہ سے قبل آپ کو اجازت درس مل گئی۔ دوسرے فنون مروجہ خطاطی، شعر و شاعری وغیرہ میں بھی آپ نے کمال حاصل کیا۔ ایک قلیل عرصہ میں آپ کا شہرہ ہوگیا اور تشنگان علم نے اس منبع علم و فضل کی طرف رخ کیا۔ مولانا فضل رسولؒ آپ کی لیاقت و

---

[۱] مولانا فضل رسولؒ کے حالات طوالع الانوار، تحفۂ فیض، بوارق محمدیہ، اکمل التاریخ کے علاوہ تذکرۂ علمائے ہند قاموس المشاہیر اور Biographical Dictionary میں بھی درج ہیں۔

قابلیت پر مہر تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ملفوظات معینی میں لکھتے ہیں......

''بفضلہٖ تعالیٰ فیض احمد مذکور کہ ہمشیر زادہ و نور دیدہ و لخت دل و قوت بازوئے خاکسار است جامع کمالاتِ انسانی است در علوم مروجہ بر معاصرین بالا دست و عقیدت محبت صحیحہ با محبان و محبوب خدا دارد۔ اللھم زد اثر طین الکمالی کہ دارد ہمینکہٗ جذبات جلیلہ حکام دنیا تضیع اوقات می کند۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرماید چونکہ حبل المتین محبت دوستان خدا دارد امید ما است[1]۔

(بفضلہٖ تعالیٰ میرے ہمشیر زادہ نور نظر لخت جگر فیض احمد میرے قوت بازو ہیں کمالات انسانی میں ماہر و باہر ہیں۔ علوم مروجہ معاصرین پر فوقیت و برتری رکھتے ہیں۔ اللہ والوں سے محبت و عقیدت رکھتے ہیں)

صاحبِ تذکرہ علمائے ہند ''مولوی رحمٰن علی'' لکھتے ہیں[2]......

مولوی فیض احمد بدایونی بن حافظ غلام احمد بن مولوی شمس الدین بن مولانا محمد علی بدایونی ولادت دے در حدود، دوازدہ صد و بست و سہ ہجری روداد جملہ علوم عقلی و نقلی، بخدمت خال خود مولوی شاہ فضل رسول بدایونی بکمال تحقیق و تدقیق تحصیل نمودہ مرید مولانا شاہ عبدالمجید جد مادری خود بود تشریح کمالاتِ علمیہ و حالات قدسیہ دے دریں مختصر گنجائش ندارد۔

(ص: ۱۶۵، ۱۶۶)

بیعت :- جب مولانا نے علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر لی تو علوم باطنی کا خیال آیا حضرت اچھے میاں مارہرویؒ کے خلیفہ اجل آپ کے نانا حضرت مولانا عبدالمجیدؒ مسند رشد و

---

[1] بحوالہ اکمل التاریخ جلد اوّل، ص: ۶۰

[2] انہیں خیالات کا اظہار تحفۂ فیض میں مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی اور بوارق محمدیہ مصنفہ فضل رسول صاحب کے آخر میں قاضی معین الدین میرٹھی نے مولانا فیض احمد بدایونی کے متعلق کیا ہے۔ (ص: ۱۶۵-۱۶۶)

ہدایت پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نے سلسلہ قادریہ برکاتیہ میں اپنے نانا صاحب سے بیعت فرما کر علوم باطنی کی تکمیل کی۔

درس و تدریس :- آپ نے جب مسند درس کو سنبھالا تو ایک عالم مستفید ہوا۔ طلباء سے ایک خاص تعلق ہوتا تھا۔ ان کی خبر گیری اور بسا اوقات ان کی مدد کرنا آپ کے معمولات سے تھا۔ دوران ملازمت میں بھی آپ طلباء کو درس دیتے تھے اور یہ اس دور کی خصوصیات سے تھا۔ آپ کے تلامذہ کا شمار دشوار ہے۔ بدایوں کے مقامی تلامذہ میں مولوی صبیح الدین عباسی، قاضی شمس الاسلام، مولوی سید دولت علی نقوی قبائی، مولوی حکیم غلام صفدر، مولوی محمد اسحٰق صدیقی، مولوی محمد بخش صدر الصدور، مولوی علی بخش خاں صدر الصدور، مولوی محمود بخش صدر الصدور، مولوی کرامت اللہ منصف، مولوی محمد حسین، مولوی نجابت اللہ، خلیفہ غلام حسین، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد سعید، مولوی نور محمد وغیرہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں[1]۔ بیرونجات کے شاگردوں میں مولوی سید احمد حسن عرشی قنوجی، مولوی عبد الصمد قنوجی، مولوی فضل احمد فرخ آبادی، مولوی سراج و اولاد احمد سہسوانی کے نام ملتے ہیں۔

آگرہ میں دوران ملازمت جنھوں نے تعلیم پائی، ان میں مولوی سید اولاد علی اکبر آبادی اور مولوی باسط علی کے نام نمایاں ہیں۔

ملازمت :- آغاز ملازمت کی تاریخ کا صحیح تعین نہ ہو سکا مگر خیال ہے کہ کچھ دنوں مسندِ درس بدایوں سنبھالا چونکہ آپ کے ماموں صاحب سر رشتہ دار رہ چکے تھے۔ لہٰذا اسی تعلق کی بنا پر آپ نے بھی انگریزی ملازمت اختیار کی ہوگی اور پھر اہلیت و قابلیت کے اعتبار سے آپ اس کے مستحق بھی تھے۔ بدایوں کے ایک رئیس چودھری تفضّل حسین فاروقی[2] (ولد محمد

---

[1] ۔ یہ بدایوں کے نامور اور مشہور لوگ گذرے ہیں۔ ان کے حالات اکمل التاریخ نیز بدایوں کے دوسرے خاندانی تذکروں میں موجود ہیں۔

[2] ۔ محلّہ چودھری سرائے کے رئیس تھے۔ غدر میں حصہ لیا۔ انگریزی تسلط ہونے پر روپوش ہو گئے۔ ایک گھوڑے پر سوار جنگلوں میں گھومتے پھرتے۔ سائیس آبادی میں جا کر کھانے کا انتظام کرلاتا، گھر جائیداد نیلام ہوئی۔ عام معافی پر ظاہر ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔ آپ کے پوتے معزز حسین ولد مقدس حسین کراچی (فاروق آباد) میں مقیم ہیں۔

عظیم) زمیندار سرائے چودھری کے ایک خاندانی قضیہ کے تصفیہ میں پنچایت میں دوسرے عمائدین کے ساتھ ساتھ مولانا فیض احمد صاحب کی بھی مہر راقم کی نظر سے گذری۔ یہ واقعہ و فیصلہ ۱۲۵۲ھ- ۱۸۳۶ء کا ہے۔ اس سے خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس وقت تک قیام بدایوں ہی میں ہو، اگر چہ یہ یقینی نہیں لیکن اس سے یہ امر تو واضح ہے کہ شہر کے معاملات نزاعی میں آپ سے رجوع کیا جاتا تھا اور آپ ان کو باحسن وجوہ نبٹاتے تھے۔ آپ کی مہر بشکل مستطیل تھی اور اس میں ''فیض احمد'' مسند درج تھا۔

آپ کے آغاز ملازمت کے سلسلہ میں صاحب اکمل التاریخ بھی خاموش ہیں اور ''تحفۂ فیض'' میں تو صرف اشارہ ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ملازمت کا آغاز بدایوں ہوا ہو جو زیادہ قرین قیاس ہے پھر آپ آگرہ پہنچے ہوں۔ آگرہ اس وقت صوبہ کا صدر مقام تھا۔ صدر نظامت آگرہ میں اوّل آپ مسل خواں پھر پیشکار ہوئے اور آخر میں بورڈ آف ریونیو میں سرشتہ دار ہو گئے۔ فرائض منصبی نہایت دیانت محنت اور راستبازی سے انجام دیتے تھے۔ حکام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے[1]۔ اسی زمانہ میں ولیم میور نے جو کہ وہاں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا اور بعد کو لفٹننٹ گورنر صوبہ یوپی (۱۸۶۸ء-۱۸۷۲ء) ہوا۔ آپ سے عربی پڑھی۔ اس متعصب انگریز گورنر یو. پی. نے کذب وافترا سے بھری ہوئی کتاب ''لائف آف محمد'' لکھی، جس میں آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پر ناروا حملے کئے ہیں اور جس کا جواب بڑے مدلّل طریقے پر سرسید احمد خاں نے دے کر اس وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔

قیام آگرہ :- مولانا فیض احمد نے اخلاق بڑا وسیع پایا تھا۔ اہالیان وطن کی آپ بڑی مدد کرتے تھے۔ بدایوں کا جو شخص پہنچا اور جس کام میں مدد کا خواستگار ہوا۔ اس کی حتی الوسع امداد کی۔ قیام وطعام کی کفالت کرتے، بعض اوقات ان مصارف کے لئے قرض کی

---

[1] اکمل التاریخ جلد اوّل

ضرورت ہوتی۔

صاحب اکمل التاریخ لکھتے ہیں......

> ”باوجود ثروت و وقار کے دل فقیرانہ، مزاج شاہانہ تھا، فقرا سے محبت غرباء سے اُلفت، طلبا کے شائقین اور علم کے شیدائی تھے۔ شاگردوں کی تمام ضروریات کے خود متکفل ہوتے تھے۔ سلسلہ درس و تدریس اقامت آگرہ میں برابر جاری رہا“۔

آگرہ اس وقت علماء فضلاء کا مرکز تھا۔ مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار، مولوی کریم اللہ خاں صدر الصدور، مولانا قاسم داناپوری، مولانا غلام امام شہید، مولوی امام بخش وکیل صدر، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، شیخ محمد شفیع اللہ الہ آبادی، مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین، مولوی محمد باسط علی، مولوی محمد معین الدین، مولوی شیخ اعتقاد علی وکیل، مرزا اسد علی بیگ وکیل، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مفتی عبدالوہاب گوپاموی، مولوی نور الحسن، سید رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیر آبادی، مولوی فیض احمد بدایونی اور مولوی ڈاکٹر وزیر محمد خاں جیسے حضرات موجود[1] تھے اور جن کی نشست اکثر مفتی انعام اللہ خاں کے یہاں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کا مکان اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دراصل اس وقت آگرہ میں ان حضرات کے اجتماع پر آسمان کو بھی رشک آتا ہوگا۔ آخر الذکر حضرات مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں میں بہت خصوصی تعلقات تھے۔ دونوں بڑے فاضل اور علم و فضل کے شیدائی تھے۔ طبائع کی مناسبت اور خیالات کی یکسانیت نے دونوں کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ مثل ایک جان دو قالب کے تھے ہر کام میں ایک دوسرے کے معین مددگار اور پیہم و شریک رہتے تھے اور یہ پیمانِ وفا ایسی نیک ساعت میں بندھا تھا کہ آخر دم تک مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور پھر دونوں نے مفقود الخبری کی چادر اوڑھ کر انگریزی

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء۔

حکومت کو منہ نہ دکھایا۔

مناظرہ مابین مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ہم دوش مذہب عیسوی نے بھی فروغ حاصل کیا اور ہر ممکن صورت سے اس مغلوب ملک کو مذہبی حیثیت سے بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ کمپنی کی تائید و اعانت سے مذہب مسیحی کی تنظیم اور ترقی عمل میں آئی ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ اس تنظیم کے آثار قائم کیے گئے چرچ، مشن سوسائٹی، بائبل سوسائٹی، مشن فنڈ، مشن اسپتال، مشن کالج اور مدارس جا بجا قائم ہوئے۔ مذہبی کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے رجحانات و عقائد بدلنے کی کوشش کی گئی۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسائیوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر (Revd. C.C.P. Fondar) یورپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے اور اس کی جماعت نے دل شکن تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کی کتاب ''میزان الحق'' نے خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظرہ کا گڑھ ٹھہرایا کیونکہ آگرہ ہی اس وقت علماء کا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہاں کسی طرح فتح ہو گئی تو عیسائیت کی تبلیغ میں بڑی مدد ملے گی۔ اس نے مشاہیر علماء کو چیلنج دیا مجلس علماء میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کر لیا اور مذہب عیسوی کے مشہور ماہر و مناظر مولوی رحمت اللہ کیرانوی[1] جو کہ عرصہ سے پادری مذکور سے خط و کتابت کر رہے تھے، بلائے گئے انھوں نے چھلی اینٹ آگرہ میں قیام کیا۔

---

[1] رحمت اللہ خاں خلیل اللہ عرف خلیل الرحمٰن ولد حکیم نجیب اللہ قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر محلّہ دربار کلاں میں ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بزرگوں سے حاصل کی پھر دہلی مولوی محمد حیات صاحب اور لکھنؤ مولانا سعد اللہ مرادآبادی، مولانا احمد علی صاحب ساکن بڈولی ضلع مظفر نگر اور مولانا عبد الرحمٰن چشتی وغیرہ سے علوم معقول و منقول حاصل کیے۔ رد عیسائیت میں مناظر کامل تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہیں ۲۲/ رمضان ۱۳۰۸ھ میں انتقال ہوا۔

ضروری انتظامات کے بعد ۱۱؍ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰؍ اپریل ۱۸۵۴ء بروز پیر کٹرہ عبدالمسیح آگرہ میں مناظرہ کا پہلا اجلاس ہوا۔ اہل اسلام کی جانب سے مناظر اول مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے جن کے معین و مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اوّل پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ تھے۔ مجلس مناظرہ میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچن سکنڈ، صوبہ بورڈ مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمان حکومت پادری، ولیم گلبن، مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد سہسوانی، مولوی امیر اللہ مختار، راجہ بنارس، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، مفتی خادم علی مہتمم مطلع الاخبار، مفتی سراج الحق، مولوی کریم اللہ خاں بچھرایونی، پنڈت جگل کشور، راجہ بلوان سنگھ (بنارس)، قاضی حکیم فرخند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام نیز اور بہت سے علماء عمائدین اور روسائے شہر موجود تھے[1]۔ شرائط مناظرہ میں یہ خاص شرط تھی کہ مغلوب کو غالب کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ دو روز تک مناظرہ ہوا۔ پادری فنڈر کو انجیل کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا اور اس نے شکست فاش کھائی اور آگرہ سے راہ فرار اختیار کر کے سیدھا یورپ پہنچا، اس مناظرہ کی پوری کیفیت ''البحث الشریف فی اثبات التنسیخ والتحریف'' کے نام سے وزیر الدین نے مرتب کی اور حافظ عبداللہ کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ ہی میں فخر المطابع شاہجہاں آباد میں ولی عہد مرزا فخرو کے صرفہ و حکم سے چھپ کر اکناف و اطراف ہند میں تقسیم کی گئی۔ اسی مناظرہ اکبر آباد کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اوّل ''مباحثہ مذہبی'' اور دوسرا حصہ ''مراسلات مذہبی'' کے نام سے سید عبداللہ اکبر آبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے مطبع منعمیہ اکبر آباد میں ۱۲۷۰ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرہ کی روداد ہے اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب اظہار الحق کے حاشیہ پر مطبوعہ

---

[1] ایک مجاہد معمار (سوانح مولانا رحمت اللہ) شائع کردہ دار العلوم حرم صولتیہ مکہ معظمہ۔

ہے جو کہ مطبع محمودیہ قاہرہ مصر سے ۱۳۱۷ھ میں طبع ہوا ہے۔ غرض اس تاریخی مناظرہ میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کو ہر قسم کی مدد دی اور ان کی کامیابی کے ممد ہوئے اور یہ دوران ملازمت میں بڑا کام تھا۔

جامع مسجد آگرہ کا ایک خاص واقعہ :- برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ مذہبی انحطاط بھی شروع ہوا۔ جس کے مفصل حالات جا بجا ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں۔ نواہی کی کثرت اور اوامر سے پہلو تہی مسلمانوں کی زندگی کے عام واقعات تھے۔

۱۸۳۵ء میں صدر نظامت کا دفتر آگرہ منتقل ہوا۔ علماء کی اچھی خاصی تعداد صدر نظامت کے سلسلہ میں منتقل ہو کر آگرہ آئی جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار نیز دوسرے علماء جب پہلی مرتبہ آگرہ کی شاہی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے گئے تو دیکھا کہ نمازیوں کی تعداد صرف ساٹھ یا ستّر (۷۰) افراد پر مشتمل تھی یہ شہر آگرہ کا حال تھا جو کہ دور مغلیہ سے مسلمانوں کا مرکزی شہر چلا آ رہا تھا۔ ذرا جامع مسجد آگرہ کا بھی حال سنئے۔ اندر کا صرف صدری دروازہ نمازیوں کے لئے کھلا ہوا تھا، باقی تمام دروازے بند تھے، کبوتر پلے ہوئے تھے اور باقاعدہ مسجد سے کبوتر اُڑائے جاتے تھے اور خرید وفروخت ہوتی تھی۔ مسجد خاص میں سوت کی رسیاں بٹی جاتی تھیں۔ یہ ناگفتہ بہ حالات[۱] تھے۔ مسجد کی تمام دوکانیں پیش امام اور متولیوں نے بنیوں کے پاس رہن رکھ دی تھیں اور اوقاف کی آمدنی خوب اُڑاتے تھے۔ مولانا فیض احمد رسوا بدایونی صاحب کلکٹر آگرہ فنلے کے پیشکار تھے۔ کلکٹر ان کی حسن کارگزاری اور لیاقت کا بہت معترف تھا۔ مولانا فیض احمد بدایونی کو جامع مسجد آگرہ کی دوکانوں پر ہندوؤں کے مالکانہ قبضہ کا بہت افسوس تھا۔ چنانچہ

---

[۱] مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی ان واقعات کے راوی ہیں۔ انھوں نے یہ واقعات اپنے والد مفتی اکرام اللہ

آپ نے ایک روز کلکٹر آگرہ مسٹر فنلے سے جامع مسجد آگرہ کی دوکانوں کے رہن ہونے اور ہندوؤں کے قبضہ کا ذکر کیا اور دوکانوں کے واگذاشت ہونے کی درخواست کی، کلکٹر نے قانونی مجبوری کا عذر کیا۔ مولانا فیض احمد بدایونی نے عرض کیا کہ قانون کی رو سے ہی دوکانیں ہندوؤں کے قبضہ سے نکل سکتی ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی اصل رقم معہ سود کے جوڑی جائے اور برسوں سے جو ان کا دوکانوں پر قبضہ وتصرف ہے اس کے بدلے میں شرح مروجہ سے کرایہ لگا یا دیا جائے۔ کلکٹر کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ مولانا فیض احمد بدایونی کی تجویز کے مطابق عمل درآمد ہوا۔ دوکانیں ہندوؤں کے قبضہ سے نکل آئیں اور کچھ رقم بھی ہندوؤں کے ذمہ بہ سلسلہ کرایہ واجب الادا نکلی۔ مولوی سعید احمد صاحب مارہروی مؤلف ''امرائے ہنود'' نے جامع مسجد آگرہ کے اس مقدمہ کی پوری مسل ملاحظہ فرمائی ہے جس سے مولانا فیض احمد بدایونی کی مساعی جمیلہ کا حال معلوم ہوا[1]۔

مولانا فیض احمد صاحب بدایونی کا یہ کارنامہ جامع مسجد آگرہ کے سلسلہ میں بڑا اہم ہے۔ دوکانوں کے واگذاشت ہونے کے بعد مسجد کے انتظام کو درست کیا گیا۔ کبوتر بازوں کی سرگرمیوں اور رسی بٹنے کی لعنت کو ختم کر کے مسجد کی درستی و مرمت کرائی گئی اور مسجد کے انتظام کے لئے لوکل ایجنسی آگرہ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت آج تک جامع مسجد آگرہ کا انتظام ہے۔

آگرہ میں شاہ احمد اللہ کی آمد :- مولانا سید احمد اللہ مدراسی سید محمد علی کے صاحبزادے اور ابوالحسن شاہ گولکنڈہ کی اولاد سے تھے۔ عالم فاضل اور فنون حرب کے ماہر تھے۔ یورپ نیز دوسرے ممالک اسلامیہ کی سیر کی۔ سیّد قربان علی جے پوری اور حضرت محراب شاہ قلندر گوالیاری سے اجازت وخلافت حاصل تھی اس وقت برّصغیر کی سیاسی حالت عجیب دور سے گذر رہی تھی۔ مسلمان تباہ و برباد ہو رہا تھا، اس کی عزت و ناموس غیر

---

[1] مفتی انتظام اللہ شہابی سے یہ واقعات معلوم ہوئے جن کو مولوی سعید احمد صاحب مارہروی نے بتائے تھے۔

محفوظ تھی۔ انہدام مساجد اور تذلیل و تحقیر اسلام عام بات تھی۔ حضرت سید احمد اللہ شاہ نے انگریز کے خلاف جہاد کا مسلسل ارادہ قائم کر کے اوّل دہلی کا رخ کیا وہاں عجیب ہنگامہ تھا بادشاہ مجبور شاہزادے اور امراء مدہوش و عیاش، علماء سرکار کمپنی کے عہدوں پر ممتاز محکمہ قضاء ٹوٹا کسی نے احتجاج تک نہ کیا۔ علماء اور شیوخ طریقت اپنے اپنے کام میں مصروف حضرت احمد اللہ شاہ نے اوّل مشائخ طریقت اور علماء کرام سے رجوع کیا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا مگر ان کے رونے دھونے کو کسی[1] نے نہ سنا صرف مفتی صدر الدین آزردہ نے کچھ آمادگی ظاہر کی۔ بعد مشورہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے شاہ صاحب کو معہ ایک خط کے آگرہ روانہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب وہ خط لے کر مفتی انعام اللہ خاں بہادر وکیل سرکار کے پہنچے۔ انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی یہاں علماء فضلاء کا اجتماع تھا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شاہ صاحب کی بڑی عزت ہوئی محفل سماع اور وعظ کا دور شروع ہوا اور شاہ صاحب کو یہاں اپنے خواب کی تعبیر نظر آنے لگی۔ بہت لوگ معتقد ہو گئے۔ یہاں تک کہ حکومت کو بھی فکر ہوئی مگر کچھ نہ کر سکی۔ مولانا فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے حضرت شاہ صاحب سے رازدارانہ باتیں کیں اور دونوں نے حضرت شاہ صاحب کو معاونت کا یقین دلایا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں......

> ہر ایک نے شاہ صاحب کو آنکھوں پر جگہ دی۔ مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی و ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی جیسے لوگ شاہ صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ (ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)

حکومت نے حضرت شاہ صاحب کے معتقدین اور علماء (عہدیداران صدر نظامت) پر ایک جھوٹا مقدمہ چلا کر ان علماء کو منتشر کرنا چاہا اور اس بہانہ سے حضرت احمد اللہ شاہ کے کام میں

---

[1] دہلی اس وقت علما اور مشائخ کا مرکز تھا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء میں ان حضرات کے نام بھی دیئے ہیں اور تفصیلات بھی دی ہیں۔

رکاوٹ ڈالنی چاہی مگر اس ولسن گردی[1] سے تمام ملزمین بے داغ چھوٹے۔ خدا کی قدرت سے اس زمانہ میں ہنومان گڑھی کا حادثہ فاجعہ پیش آیا۔ مہنتوں نے مسجد میں اذان بند کر دی۔ مسجد کے ایک حصہ کو نقصان پہنچایا۔ شاہ اودھ سے رجوع کیا گیا۔ مگر صدائے برنخاست جولائی ۱۸۵۵ء میں شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح نے مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ہمراہ بیراگیوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ اس خونیں حادثہ اور ہتک ناموس اسلام کے بعد مولوی امیر علی امیٹھوی نے علم جہاد بلند کیا مگر اودھ کی بے غیرت حکومت کو ہوش نہ آیا اور نوابی فوج اور گوروں کی پلٹن نے گھیر کر سب کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کی حکومت میں خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کی اس بیدردی سے خونریزی پر آسمان تھرّا اُٹھا، زمین کو زلزلہ آیا۔

حضرت مولانا احمد اللہ شاہ صاحب نے آگرہ میں یہ خبر سنی مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں سے مشورہ ہوا اور ان کو بعض ہدایات دے کر مع معتقدین کے شاہ صاحب کانپور پہنچے۔ مولوی عظیم اللہ سے گفتگو ہوئی، پھر لکھنؤ و فیض آباد پہنچے۔ شاہ صاحب نے تقریر کے ذریعہ ایک آگ لگا دی۔ مریدین کا اجتماع ہونے لگا۔ حکومت اودھ کو خطرہ پیدا ہوا، حاکم فیض آباد نے فوجی قوت سے روکنا چاہا۔ آخر مقابلہ ہوا اور شاہ صاحب قید ہو گئے۔

حضرت شاہ احمد اللہ شاہ صاحب کی اسیری کی خبر جب آگرہ پہنچی تو مریدین و معتقدین میں برہمی پھیلی۔ مولوی فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں خاص طور سے سخت پریشان ہوئے اور موقعہ کا انتظار ہونے لگا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء :- انگریزوں نے ملک میں ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ امراء پریشان، رعایا ناخوش اور ملک تباہ ہو رہا تھا۔ راجے، نواب برباد، نظام تعلیم معطل و منصب قضاء

---

[1] رشوت کے الزام میں یہ مقدمہ قائم ہوا۔ مسٹر ولسن جج مراد آباد سماعت مقدمہ کو مقرر ہوا۔ گواہوں نے جھوٹی گواہی سے پہلوتہی کی مگر پھر بھی مولوی غلام جیلانی رئیس اور مولوی غلام امام شہید، منشی سراج الدین، مولوی محمد قاسم داناپوری، بدر الحسن، مسل خواں ماخوذ ہوئے صدر میں اپیل ہوئی، سب بری ہوئے۔ یہ واقعہ ولسن گردی کے نام سے مشہور ہے۔

معزول اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ عیسائیت کی تبلیغ کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ حکومت اودھ ختم ہوئی۔ راجے، نواب، بے دخل ہوئے، برائے نام شاہ دہلی کے خطاب کی ضبطی کی نوبت بھی پہنچی۔ غرضیکہ یہ حالات تھے کہ چربی کے کارتوسوں کا فوج میں رواج ہوا جس نے بارود پر آگ کا کام کیا۔

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی فوجوں نے بغاوت کی اور دہلی کی جانب بڑھیں۔ شاہ دہلی نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ فیض آباد میں مولوی احمد اللہ نے مجاہدین کی کمان سنبھالی اور حضرت محل کی معاونت کی۔ روہیل کھنڈ میں نواب خان بہادر خان نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے سرداری وقیادت کے فرائض انجام دیئے۔ ان خبروں کے پہنچنے پر آگرہ میں شروع میں کچھ حالت قابل اطمینان رہی، مگر جب میرٹھ اور دہلی کی فوجوں کی بغاوت اور مجاہدین کے معرکوں کی خبر آگرہ پہنچی۔ جونس کالون لفٹنٹ گورنر بہادر نے سب فوج ہندوستانی اور انگریزی کو جمع کر کے فہمائش کی اس کا اثر چند روز رہا آخر آگرہ کی سپاہ بھی باغی ہوگئی اور مجاہدین سے مل گئی اور آزادئ وطن میں کوشاں ہوئی۔ انگریزوں نے قلعہ کو جائے پناہ قرار دیا۔ ماہ جون میں یہاں بھی واقعات شروع ہوئے جولائی میں تیزی آئی۔ مجاہدین فوج کی سرپرستی ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی نے کی۔ مگر حالات کا جب گہرا جائزہ لیا اور دہلی سے پیام وسلام کے ذریعہ طلبی ہوئی تو کچھ مسلح سپاہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دہلی روانہ ہوگئے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں......

> ”ڈاکٹر وزیر خاں مردانہ وار میدان میں نکل آئے آگرہ میں جو فوج فدائیوں کی آئی اس کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے کی انگریز قلعہ بند ہو گئے۔ یہ (ڈاکٹر وزیر خاں) مولوی فیض احمد بدایونی کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے۔ (غدر کے چند علماء)

واقعات دھلی :- دہلی میں بہادر شاہ نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نیز دوسرے علماء دہلی میں موجود تھے۔ جنرل بخت خاں معہ روہیلہ فوج کے بریلی سے دہلی پہنچ چکے تھے۔ دہلی میں ہنگامہ آرائی تھی، اہالیان شہر دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک بہادر شاہ کا طرفدار اور دوسرا حکومت کمپنی کا وفادار، فوج لالچ میں گھری تھی۔ مجاہدین کی جماعت میں روہیلوں کی جماعت جو جنرل بخت خاں کے زیر کمان تھی سب سے زیادہ بہادر اور مجاہدانہ جذبہ سے سرشار تھی اور داد شجاعت دے رہی تھی۔ جنرل بخت خاں کے مشورے سے علامہ فضل حق خیر آبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتاء مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتوے کی تیاری میں جنرل بخت خاں کی کوشش خاص تھی۔ مفتی صدر الدین صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سیّد مبارک شاہ رامپوری، مولوی محمد سعید نے اپنے اپنے دستخط اور مواہیر سے فتویٰ کو مرتب و مزین کیا۔ اس فتویٰ کی نقول اکناف واطراف ملک میں دم کے دم میں شائع ہو گئیں اور اس کی اشاعت سے ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔

دہلی میں جنرل بخت خاں کی فوج کی حالت سب سے اچھی تھی۔ بادشاہ کو جنرل بخت خاں پر بڑا اعتماد تھا۔ جلوت وخلوت میں ہر وقت بادشاہ کی باریابی کی اجازت تھی۔ جنرل بخت خاں کو لارڈ گورنر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے اپنی معاونت ومشورہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں کو اپنے ساتھ رکھا۔ مولوی فیض احمد بدایونی مرزا مغل کے پیشکار مقرر ہوئے۔ جنرل بخت خاں کو ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی پر بڑا اعتماد تھا۔ چونکہ مرزا مغل کی حالت مشتبہ تھی اور وہ حضرت محل اور مرزا الٰہی بخش کی سازشوں کے شکار بنے لہٰذا ان کی حالت سے باخبر رہنے کی وجہ سے مولوی فیض احمد بدایونی کو ان کا پیشکار مقرر کیا گیا ہوگا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے ''ایسٹ انڈ کمپنی اور باغی علماء'' میں لکھا ہے کہ مولوی فیض احمد بدایونی دہلی میں

مجسٹریٹ بھی بنائے گئے لیکن اس کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی۔

ھنگامہ کار زار :- دہلی میں جنرل بخت خاں نے بڑے معرکے سر کئے۔ انگریزی فوج نے ہر جگہ اس بہادر جانباز جنرل سے شکست کھائی دراصل جنرل بخت خاں کی فوج بہت باقاعدہ اور بہادر تھی۔ اس کی تصدیق بطور عینی شاہد کے مرزا ظہیر دہلوی کے روزنامچہ غدر سے ہوتی ہے۔ ایک دوسری شہادت سنئے......

> ’’جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی اور ان کو معلوم ہو گیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے باغی فوج نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا اور کوئی تدبیر و دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے میں اور غارت کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔ دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک بہت اچھے موقعہ پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی۔ توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سرکیں اور اس سرعت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہ تھا‘‘۔ (رسالہ تاریخ بغاوت ہند بحوالہ ’’۵۷ء کے ہیرو‘‘ از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

ولیم فورس لکھتا ہے......

> ’’محاصرہ کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملہ کئے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد ۳۶ تھی۔ ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظّم اور باقاعدہ اقدام اور حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے دور افتادہ چوکیوں اور ہراول پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے قریب بہت کم آتے تھے اور یہ بھی جب اس پر اچانک

> حملہ کر دیا جاتا تھا مگر روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے۔ ان کی مستقل جرأت و بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جا سکتی تھی‘‘۔

(غدر عظیم کا تذکرہ بحوالہ ۵۷ء کے ہیرو)

از سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی

مرزا مغل کا دل صاف تھا اور وہ دشمنوں اور غداروں کے کہنے سے جنرل بخت خاں سے بدظن ہو کر انگریزوں کی طرف جھکنے لگے۔ کشمیری گیٹ کا مورچہ مرزا مغل کے سپرد تھا جس میں ایک حصہ فوج کی کمان ڈاکٹر وزیر خاں کے سپرد تھی اور اسی حصہ فوج میں مولوی فیض احمد بدایونی بھی شریک معرکہ تھے۔

ڈاکٹر وزیر خاں کے زیر کمان سپاہیوں نے بڑی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا مگر کشمیری گیٹ پر مرزا مغل نے شکست کھائی۔ جنرل بخت خاں کے کہنے پر ڈاکٹر وزیر خاں اپنی فوج کو لے کر علیحدہ ہو گئے، ورنہ گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ جنرل بخت خاں مقبرہ ہمایوں پہنچ کر بادشاہ سے ملے اور صورت حال سے مطلع کیا۔ مقبرہ سے نکلنے کو کہا، زینت محل نے باز رکھا۔ بادشاہ اگر اس وقت مقبرہ سے باہر نکل آتے تو صورت حال کی تبدیلی کی قوی اُمید تھی کمپنی کی فوج نے ۱۹؍ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر ہڈسن کی کمان میں مکمل قبضہ کر لیا۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی وغیرہ نے دہلی چھوڑ دی۔

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں......

> ’’بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے معہ متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انھیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی

> فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے، آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد وغیرہ سب لکھنؤ چلے گئے''۔

باغی ہندوستان ۵۷ء
از مولوی عبد الشاہد خاں شروانی

ورود لکھنؤ :- جب فیض آباد میں مولوی سکندر شاہ اور ان کی جماعت کو شکست ہو گئی تو مولوی سید احمد اللہ شاہ لکھنؤ روانہ ہوئے اور مولوی احمد سبط مولوی غلام علی کی جماعت کو بڑی تقویت پہنچائی اور سب کو مجتمع کیا۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں مرزا برجیس قدر کی تخت نشینی ہوئی۔ ممو خاں (ناصر الدولہ علی محمد خاں) تمام سیاہ سپید کا مالک ہوا۔ حضرت محل والیہ مقرر ہوئیں۔ رعایا مولوی امیر علی کے واقعہ ہنومان گڑھی سے بدظن تھی اس پر ممو خاں کے ظلم مستزاد، مولوی احمد اللہ شاہ اہالیان اودھ کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ حضرت محل نے بھی شاہ صاحب سے خصوصی تعلقات پیدا کئے آٹھ ماہ گزر گئے۔ دلّی، آگرہ، کانپور میں انگریزوں نے قبضہ جما کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ تمام سرداران جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی، مولوی عظیم اللہ کانپوری، نواب تفضّل حسین فرخ آبادی، نانا راؤ، شہزادہ فیروز شاہ، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، قاضی سرفراز علی شاہجہاں پوری وغیرہ وغیرہ مختلف مقامات سے آ کر شاہ احمد اللہ صاحب سے آ ملے۔ پہلا معرکہ نواب گنج میں ہوا، مجاہدین کامیاب ہوئے اور رسد خانے کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ مچھی بھون کو اُڑا دیا۔ غرض لکھنؤ پر شاہ صاحب کا پورا پورا عمل ہو گیا۔ بیلی گارڈ پر بھی قبضہ ہو گیا تھا کہ ممو خاں کی مخالفت و نالائقی سے پسپا ہونا پڑا۔ آخری معرکہ عالم باغ میں ہوا۔ جنرل مارٹن نے مورچہ قائم کیا۔ جنرل بخت خاں مقابل ہوئے۔ ایک مورچہ پر یوسف خاں اور ممو خاں مقرر ہوئے۔

چکراولی کوٹھی پر خود شاہ صاحب نے معہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی کے مورچہ سنبھالا۔ حضرت محل بھی موجود تھیں۔ انگریزی فوج سے ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ مجاہدین نے بڑی دادِ شجاعت دی جب شاہ صاحب نے اپنا مورچہ بگڑتا دیکھا تو مورچہ بدل دیا اور آخری جنگ عیش باغ میں ہوئی۔ حضرت محل اور ممو خاں گھبرا گئے اور حضرت محل ۱۶/ مارچ ۱۸۵۸ء کو مرزا برجیس قدر کو لے کر نکل کھڑی ہوئیں جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ شاہ صاحب معہ اپنے رفقاء ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی میدان میں ڈٹے رہے اور بڑی بہادری سے لڑتے رہے۔ آخرش موقعہ کی نزاکت دیکھ کر شاہجہاں پور چلے گئے چونکہ شاہ صاحب کے ہمراہ تحریک کے بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ نواب خان بہادر خاں نے بریلی سے لکھا کہ پچاس ہزار روہیلہ متابعت کو تیار ہیں، تشریف لائیے۔ شاہ صاحب نے شاہجہاں پور چھوڑنا مناسب نہ سمجھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے ان سرداروں کو روہیل کھنڈ کے مختلف اطراف میں پھیلا کر مختلف مورچوں اور مقامات پر مجاہدین کی مدد اور قیادت کے لئے بھیج دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی گنگا کو عبور کر کے بدایوں پہنچے۔

معرکہ بدایوں (ککرالہ) :- بدایوں میں نواب خان بہادر خاں کی طرف سے ۱۷/ جون ۱۸۵۷ء کو عبدالرحمٰن خاں ناظم اور نیاز محمد خاں سپہ سالار فوج مقرر ہوئے۔ سابق ملازمین کو ان کی جگہ برقرار رکھا گیا اور نئے تقررات بھی ہوئے اور ناظم نے بہت خوبی سے ضلع کا انتظام کیا۔ بلوائیوں کی سرکوبی کی اور مفسدین کو کیفر کردار کو پہنچایا۔ ہرلال سنگھ ساکن بکسینہ دھپو دھام کا لقب اختیار کر کے راجپوتوں کی ایک جماعت لے کر شہر بدایوں پر چڑھ آیا۔ سرحد پر لڑائی ہوئی آخر شکست کھا کر بھاگ گیا۔

نومبر ۱۸۵۷ء تک تمام ضلع بدایوں پر نواب خان بہادر خاں کا قبضہ ہوگیا۔ نیاز محمد خاں نے فتح گڑھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ۲۰/ جنوری ۱۸۵۸ء میں ککرالہ کے لوگوں کی مدد سے

فرخ آباد میں داخل ہوا۔ بدایوں چھوڑے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ مسٹر ہوگرانٹ نے چھاپہ مارا اور کامیاب ہوا۔ شروع اپریل ۱۸۵۸ء میں محسن علی خاں جو کہ نواب فرخ آباد کا معاون خصوصی تھا۔ شاہ جہاں پور سے ہوتا ہوا بدایوں آیا، ڈاکٹر وزیر خاں مولوی فیض احمد بدایونی اور فیروز شاہ شہزادہ بدایوں پہنچ چکے تھے۔ مجاہدین میں جوش وخروش پیدا کرنے کی غرض سے مولوی فیض احمد بدایونی نے فتویٰ جہاد کی نشر واشاعت کی، نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ تین سو تازہ دم سپاہی بریلی سے آ گئے۔ حکیم سعد اللہ اور ان[1] کے کچھ ساتھی آنولہ سے آکر شریک ہوئے تھے۔ انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے مورچہ ڈاکٹر وزیر خاں مولوی فیض احمد بدایونی اور فیروز شاہ شہزادہ سنبھالے ہوئے تھے۔ مولوی محمد سلیمان بدایونی اپنے گرانقدر مقالہ ''بدایوں کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء'' میں معرکہ ککرالہ کے متعلق لکھتے ہیں......

> ''انگریزی فوج نے آدھی رات کو ککرالہ کی طرف کوچ کیا۔ ان کے ساتھ موضع چاند برائی کا ایک ہندو جاسوس اور دوسرا موضع رٹھول کا ایشری پرشاد تھا نصف مسافت طے کر کے دم لیا تا کہ پیدل فوج بھی آ کر اُن سے مل جاوے۔ پیدل فوج آ گئی تو اس کو حکم دیا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر چلے جلدی کی ضرورت نہیں اور اپنا کوچ توپ خانہ اور سواروں کے ساتھ جاری رکھے یہاں تک کہ ککرالہ ایک میل رہ گیا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا کہ مجاہدین کا ایک گروہ آتا نظر پڑا جنھوں نے چار توپیں گراپ کیں لیکن کوئی انگریز زخمی نہ ہوا۔ انگریزوں نے جوابی توپوں

---

[1] حکیم سعد اللہ ولد حکیم عظیم اللہ علم طب ونجوم میں ماہر کامل ۱۸۵۷ء میں آنولہ میں جنگ آزادی کے روح رواں نواب خان بہادر کی طرف سے نامہ پیام کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ککرالہ (بدایوں) اور کنپلا ضلع فرخ آباد میں مقابلہ کیا بعد غدر فرار ہوئے۔ بڑی مصیبتوں کے بعد حکیم سعادت علی خاں مدار المہام ریاست رامپور کے توسط سے معافی حاصل ہوئی ۱۹۰۷ء میں انتقال ہوا۔

کے فیر کیے۔ مجاہدین نے موقعہ پا کر انگریزوں کو تلواروں پر رکھ لیا اور کلابہ کلا لڑنا شروع کیا۔ انگریزی فوج نے مجاہدین کی شمشیر زنی کی تاب نہ لا کر پسپائی شروع کر دی اور درختوں کی آڑ لے کر توپیں چلانے لگے اس سے مجاہدین کا اتلاف جان زیادہ ہوا۔ اس بے ترتیبی اور بد نظمی میں بہت دیر میں معلوم ہوا کہ جنرل پینی غائب ہے۔

مقامی روایت ثقہ حضرات کی یہ ہے کہ انگریزوں کی آمد پر گولہ انداز نے ایسا گولہ نشانہ پر مارا کہ جنرل پینی کا سر اُڑ گیا۔ بڑی تلاش سے اُس کی نعش ملی۔ دیکھا بازو پر ایک زخم گولی کا تھا اور کسی مجاہد کی تلوار اس کا خون پی چکی تھی توپوں کی آواز سن کر سورج نکلنے پر کرنل جونس معہ پیادہ فوج کے موقعہ پر آ گیا۔ مقامی روایت ہے کہ اس فوج کے آنے سے ککرالہ کے مجاہدین انگریز کی فوج کے بیچ میں پھنس گئے اور ایک ہزار مجاہدین شہید ہوئے۔ شہزادہ نے کچھ سامان اور آدمی لے کر ککرالہ سے پچھم اور موضع گھوائی سے پورب ایک جھاڑی دار ٹیلہ کی آڑ سے مورچہ لگایا پھر بھی ناکامی ہوئی۔ مجاہدین بدایوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے توپ خانہ نے دور تک ان کا تعاقب کیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر بدایوں کا کہنا ہے کہ یہ امر تحقیق شدہ ہو گیا کہ یہ سرفروش جماعت ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی اور ان کے رفقاء (مولوی فیض احمد بدایونی اور شہزادہ فیروز شاہ کی تھی۔

ککرالہ کے معرکہ کے بعد شہزادہ فیروز شاہ مولوی فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ بریلی پہنچے۔ فیروز شاہ شہزادہ نواب خان بہادر خاں کے پاس رہ گئے اور مولوی فیض احمد و ڈاکٹر وزیر خاں شاہ احمد اللہ

صاحب کے پاس شاہ جہاں پور چلے گئے‘‘۔

شاہ جہاں پور :- شاہجہاں پور میں نواب خان بہادر خاں کی جانب سے نواب غلام قادر خاں ناظم مقرر ہوئے تھے۔ ایک سال انتظام کیا۔ ملحقہ اضلاع و مراد آباد بدایوں وغیرہ سے انگریز کامیاب ہو کر شاہ جہاں پور پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مولوی فیض احمد بدایونی، جنرل بخت خاں نیز دوسرے سردار پھر شاہ صاحب کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ۲۸؍اپریل ۱۸۵۸ء کو بچپوریہ کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ کمانڈر فوج نوابِ نظام علی[1] خاں ساکن شہباز نگر تھے نظام علی خاں نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دیئے اور آخر میں جامِ شہادت نوش کیا۔ انگریز کامیاب ہوئے۔ شہر کی حفاظتی فوج احمد اللہ شاہ کے سپرد تھی۔ جب انگریز شاہجہاں پور کی طرف بڑھے تو شاہ صاحب نے شہر خالی کر دیا۔ انگریز فوج پرانی جیل میں دمدمہ بندی کر کے مورچہ زن ہو گئی۔ شاہ صاحب نے تین روز کے بعد پلٹ کر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ۳؍مئی سے ۹؍مئی ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ محصورین کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی۔ جنرل جونس ایک فوج لے کر آ موجود ہوا۔ انگریزی فوج شاہ صاحب کے مضبوط مورچہ پر حملہ نہ کر سکی اور بے ترتیب لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اس عرصہ میں شاہ صاحب کی مدد کو فیروز شاہ اور حضرت محل کی فوجیں آ گئیں۔ ۱۵؍مئی ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب نے دمدمہ پر سخت حملہ کیا مگر جنرل جونس ثابت قدم رہا۔ ۱۸؍مئی ۱۸۵۸ء کو سر کالن کمبل بریلی سے فوج لے کر پہنچ گیا۔ شاہ صاحب موقعہ کی نزاکت دیکھ کر مع ہمراہیوں کے قصبہ محمدی چلے گئے۔

قصبہ محمدی میں قیام حکومت :- قصبۂ محمدی پر شاہ احمد اللہ صاحب نے قبضہ کر لیا۔ چاروں طرف دمدمہ بندی کی ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ کابینہ مرتب

---

[1] شہباز خاں روہیلہ بانی قصبہ شہبازنر (شاہجہاں پور) کی اولاد سے تھے۔ بڑے بہادر اور جری تھے۔ ان کے محلات کا بقیہ آج بھی شہباز نگر میں موجود ہے۔ آپ کی اولاد میں منشی مظفر علی خاں مرحوم سکریٹری میونسپل بورڈ بدایوں تھے۔

ہوئی۔ وزیر دفاع جنرل بخت خاں، قاضی سرفراز علی، قاضی القضاۃ اور نانا راؤ پیشوا دیوان مقرر ہوئے اور ارا کین کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی تھے۔ فیروز شاہ نے پہلے اختلاف کیا، پھر انھوں نے بھی شرکت کر لی۔ شاہ صاحب کا خطبہ وسکہ جاری ہوا۔

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ — حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ

احکام شرع کا نفاذ ہوا۔ مگر فلک کج رفتار کو یہ ادا کب پسند تھی۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرا کہ سر کالن کمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ سخت مقابلہ ہوا، انگریزی فوج کی طاقت اور فیروز شاہ کے اختلاف سے شاہ صاحب کو ناکامی ہوئی۔ محمدی کو چھوڑنا پڑا۔ کچھ لوگ نیپال کی طرف نکل گئے۔ ۵؍ جون ۱۸۵۸ء کو شاہ صاحب پھر نمودار ہوئے۔ جگن ناتھ سنگھ راجہ پوایاں کے بھائی بلدیو سنگھ کے کہنے میں آ گئے۔ اکیلے ہاتھی پر سوار تھے، راجہ کی گڑھی پر پہنچے، راجہ نے پھاٹک بند کر لیا۔ ہاتھی نے دو تین ٹکریں ماریں، راجہ کے ملازمین نے اوپر سے باڑھ ماری، ایک گولی شاہ صاحب کے لگی فوراً جاں بحق ہو گئے۔ سر کاٹ کر لاش پھونک دی[1]۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سر کشتہ بر نیزہ می زد نفس — کہ معراج مرداں ہمیں است بس

مولوی فیض احمد بدایونی کی روپوشی - احمد اللہ شاہ صاحب کی شہادت کے بعد سرگردہ مجاہدین منتشر ہو گئے۔ کانپور، فرخ آباد، مراد آباد، بدایوں، بریلی اور شاہجہاں پور وغیرہ پر مکمل طور سے انگریز کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مخبروں کی بن آئی تھی۔ جنرل بخت خاں، شہزادہ فیروز شاہ، ڈاکٹر وزیر خاں نیز دوسرے سربرآوردہ حضرات نے راہ فرار اختیار کی۔ فیروز شاہ شہزادہ اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ معظّمہ پہنچے۔ مولانا فیض احمد کے متعلق مشہور ہے کہ نیپال کی طرف چلے گئے اور یقینی بات ہے کہ اگر مولوی فیض

---

[1] آپ کا سر شاہجہاں پور میں دفن ہے۔ مولانا طفیل احمد منگلوری مصنف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' نے کتبہ لگوایا ہے۔

احمد معرکہ محمدی سے بچ گئے تو یقیناً ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اور فیروز شاہ شہزادہ کی فراری کے متعلق قیصر التواریخ جلد دوم میں ہے کہ[1] شہزادہ، شاہ احمد اللہ شاہ کی وفات کے بعد سندیلہ پہنچا۔ کئی جگہ مقابلہ ہوا آخر میں ۴رسو سوار رجمنٹ ۱۲ مع ظریف خاں رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خاں باقی سوار جنگی متفرق قریب ہزار کے جمع ہو کر باڑی روانہ ہوئے۔ پھر باڑی سے واپس ہو کر بلہور گھاٹ (کانپور) پر دریائے گنگا کو عبور کیا۔ شہزادہ نے ملاّحوں کو دو سو روپیہ انعام دیا۔ پھر مکن پور حضرت بدیع الدین کے مزار پر پہنچے اور وہاں سے اٹاوہ ہو کر شیر پور کے گھاٹ پر جمنا کو عبور کیا۔ راستہ میں بہادری سے لڑتا ہوا راجپوتانہ چلا گیا۔ جے پور، بیکانیر، دامن کوہسار دکن میں سرگرداں رہا۔ وہاں قوم بھیل بھی شریک ہو گئی، آخر دریائے اٹک اتر کر داخل ملک ایران ہوا اور وہاں سے حجاز پہنچا۔

شہزادہ فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں حجاز پہنچے مگر مولوی فیض احمد کا پتہ نہیں چلتا کہ راستے ہی میں ساتھیوں کو داغ مفارقت دیا یا کسی اور طرف چلے گئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر مولانا فیض احمد حجاز پہنچتے تو ضرور سراغ لگتا کیونکہ آپ کے ماموں مولانا فضل رسولؒ بدایونی نے بہت تلاش کیا اور اس سلسلہ میں ممالک اسلامیہ کا مکمل سفر کیا[2]۔ قسطنطنیہ (ترکی) تک پہنچے مگر سراغ نہ ملا۔ مولانا فیض احمد بدایونی کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سخن گستری: - مولانا فیض احمد بدایونی نے جس بہادری جانبازی اور ہمت و جرأت سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصّہ لیا اور جان و مال کی قربانی دی وہ اظہر من الشمس ہے مگر افسوس کہ ان کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے بدایوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے خاندانی تذکروں کے طور پر چار کتابیں تحفۂ

---

[1] ۱۔ عبارت میں اختصار کر دیا گیا ہے۔

[2] ۲۔ اکمل التاریخ جلد دوم ص: ۷۶

فیض، طوالع الانوار، بوارق محمد[1] اور اکمل التاریخ شائع و طبع ہوئیں مگر افسوس کہ مولانا فیض احمد بدایونی کے مجاہدانہ کارناموں کو کہیں جگہ نہ ملی۔ حالانکہ تحفہ فیض تو خاص ان کے ماموں زاد بھائی مولانا عبدالقادر بدایونیؒ نے آپ کے حالات میں مرتب کیا مگر اس میں تمام واقعہ کو اس طرح ادا کر دیا......

> ”آخر در سنہ یکہزار و دوصد و ہفتاد و سہ ترک علائق دنیا نمودہ اعانتِ دین متین بر جان و مال خود مقدم فہمیدہ ند و فی سبیل اللہ جان خود را وقف گردانیدند و بحیات سرمدی و نعیم ابدی فائز شدند“۔

(تحفۂ فیض، ص:۷)

آپ کے خاندان کے ایک ممتاز رکن مولوی انوار الحق عثمانی بدایونی اپنی کتاب طوالع الانوار میں بھی اسی طرح تمام واقعہ لکھ جاتے ہیں......

> ”صاحب ممدوح جامع کمالات محمود الصفات بے نظیر زمانہ شرائف اوصاف میں یگانہ تھے سن بارہ سو تہتر میں تائید دین متین میں للہ فی اللہ مردانہ دولت دنیا کو پیٹھ دے کر مصروف ہوئے جب سے آج تک کچھ حال معلوم نہیں ہوا“۔

(طوالع الانوار، ص:۲۳)

بوارق محمد یہ مصنفہ مولانا فضل رسول بدایونیؒ کے خاتمہ میں قاضی معین الدین میرٹھی واقعہ کو اور بھی مسخ کر کے لکھتے ہیں......

> ”در صفا، قلب و اعانتِ مسلمین و جود رہنمائی بے نظیر نمودہ اند......“
>
> ”در سنہ دوازدہ صد و ہفتاد و چہار راہی جنت گردید“۔

۱۔ بوارق محمد یہ حضرت مولانا فضل رسولؒ بدایونی کی فارسی تصنیف ردّ وہابیت میں مشہور ہے اس کے آخر میں قاضی معین الدین کیفی میرٹھی کے نام سے ایک تتمہ لگا ہے جس میں مولوی فضل رسولؒ بدایونی کا مختصر حال معہ اساتذہ تلامذہ، تصانیف وغیرہ کے درج ہے۔

اس سلسلہ کی آخری کتاب اکمل التاریخ جلد اوّل میں بھی وہی مبہم لہجہ اختیار کیا گیا ہے......

> ”آپ نے زمانۂ غدر میں آگرہ ہی سے جب کہ ہر طرف ہنگامہ جدال و قتال گرم تھا ترک علائق کر کے راہ حق میں قدم رکھا اور جادۂ فنا تک پہنچ کر بقائے جاودانی کا لطف اٹھایا کسی کو آپ کا پتہ نہ چلا کہ کہاں تشریف لے گئے“ (ج: ۲/ص: ۶۲)

پھر ذرا لطیفہ دیکھئے کہ طوالع الانوار کی عبارت سے واضح ہے کہ ۱۲۷۳ھ میں تائید دین متین میں مصروف ہوئے اور پتہ نہ چلا اور اسی طرح اکمل التاریخ کی عبارت سے بھی گمشدگی اور روپوشی کا اشارہ ملتا ہے مگر تحفۂ فیض کی عبارت سے بادی النظر میں سنہ وفات کا تعین ہوتا ہے الفاظ ملاحظہ فرمائیے......

> ”در ۱۲۷۳ھ اعانت دین متین بر جان و مال خود مقدم فہمیدند و فی سبیل اللہ جان خود را وقف گردانیدند“۔

بوارق محمدیہ کی عبارت میں اس کو بالکل صاف کر کے سن وفات کا تعین بھی کر دیا گیا جیسا کہ

> ”در سنہ دوازدہ صد و ہفتاد و چہار راہی جنت گردید“۔

سے ظاہر ہوتا ہے، اور تذکرہ علمائے ہند مؤلفہ رحمٰن علی میں تو اعانت دین متین کا ذکر چھوڑ کر صاف صاف لکھا گیا کہ[1]

> ”درحدود سال دوازدہ صد و ہفتاد و چہار ہجری رحلت فرمود“۔

حالانکہ تاریخ وفات کا تعین کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مولانا فیض احمد معرکہ محمدی میں شہید نہ ہوئے جس کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں تو ان کی حیات ۱۲۷۵ھ تک یقینی ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

---

[1] بدایونی علماء کے تراجم کے لئے مولانا عبدالقادرؒ بدایونی نے مؤلف ”تذکرہ علمائے ہند“ کو مواد بہم پہنچایا، جیسا کہ صفحات ۱۲۷، ۲۵۸ (مطبوعہ ۱۹۱۴ء بار دوم سے ظاہر ہے)۔

دن گزرے، مہینے گزرے، سالیں گزریں، یہاں تک کہ ایک صدی کے بعد اس مجاہد جلیل مولانا فیض احمد بدایونی کے کارناموں کا ذکر سب سے اوّل مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی نے اپنی تصنیفات ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء'' اور ''غدر کے چند علماء'' میں کیا۔ اگرچہ مفتی صاحب کو مکمل حالات نہ مل سکے اور کیونکر ملتے جب کہ گھر سے اخفاء و پوشیدگی کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ اس کے بعد مولوی محمد سلیمان بدایونی نے اپنے گرانقدر مقالات ''بدایوں کا جہاد حریت ۱۸۵۷ء''[۱] اور ''مورخین بدایوں''[۲] میں مولانا فیض احمد بدایونی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر کیا اور آخر میں یہ حالات مختلف کتابوں، بیاضوں، دفتروں، سینوں، سفینوں سے مرتب کئے گئے۔

شاعری :- مولانا فیض احمد بدایونی کو شعر و شاعری سے مناسبت طبعی تھی۔ رسوؔا تخلص فرماتے تھے سلاست روانی کلام کی خصوصیات ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں فکر فرماتے تھے۔ ابتدا میں عاشقانہ کلام کی طرف توجہ تھی اور استادان لکھنؤ کی پیروی کی بعد کو منقبت میں لکھا۔ چند اشعار اردو مؤلفہ خمخانۂ جاوید مولفہ لالہ سری رام ایم.اے.[۳] دہلوی میں بھی ملتے ہیں۔ اردو کا کلام ہدیۂ ناظرین ہے......

نہ طوطی شکرستاں ہوں میں نہ بلبل زار
نہ شمع بزم ہوں میں اور نہ مرغ آتش خوار
ہوں بال بال پریشان و بال جان ہے زیست
نہیں ہوں میں کسی کافر کا طرۂ طرار
کیا بتوں کے تلون نے جی پہ عرصہ تنگ
ثبات بات کو ان کے نہ میرے جی کو قرار
غلط ہے گر کوئی مریخ کو کہے جلاد
کہ میرے حق میں تو زہرہ بھی ہو گئی خونخوار
ہوں غم نصیب یاں تک کہ اب کے سال ہوا
ہلالِ عید میرے حق میں مغربی تلوار

---

[۱] ''العلم'' کراچی کی دو اشاعتوں اپریل ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

[۲] ''ذوالقرنین'' بدایوں کے ''بدایوں نمبر'' اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

[۳] لالہ سری رام نے بھی خمخانہ جاوید میں یہ شکایت لکھی ہے کہ باوجود بار بار لکھنے کے مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات نہ مل سکے۔

جو بھاگوں میں جگر خستہ تو کدھر بھاگوں — کہ سنگِ حادثہ کی ہر طرف سے ہے بوچھار
امید بہتری اب تک خیال باطل ہے — کہ سب کا اس فلک بے مدار پر ہے مدار
ہزار معنی باریک دل میں رکھتا ہوں — ہزار نالۂ موزوں کا لب پہ ہے مزمار
مگر میں کیا کروں دم مارنے کا حکم نہیں — کیا ہے ضبط غم عشق نے مجھے لاچار
یہ چرخ فتنہ دکھاتا ہے سبز باغ مجھے — جو بہر زخم ہو درکار مرہم زنگار
بہت ہیں اور بھی دنیا میں عاشقی پیشہ — مجھ ہی سے برسرگیں ہے یہ چرخ ناہنجار
ہجوم رنج و الم سے یہ حال ہے دل کا — کہ جیسے قبر منافق ہو تیرۂ و تار
دکھاؤں یاروں کو دل میں جو شورشیں ہیں بھری — مگر جہان میں نہیں جائے یک طپیدن دار
غلط ہے سنگ دلوں سے امید دل گرمی — گرچہ سنگ سے دیکھے نکلتے شرار

☆

سو آج دستِ خاک فلک سے ہوں اسقدر بیچین — کہ ایک پاؤں پہ پھرتا ہوں صورت پر کار
وہ کون ہے کہ جگہ میری اسکے دل میں ہے — وہ کون شخص ہے جس کو نہیں مجھ سے عار
حرم سے مجھ کو مسلمان منع کرتے ہیں — تو جانے دَیر دیتے نہیں مجھے کفار
زمین پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے — نہیں ہے میری دعا کو بھی آسماں پر بار

فارسی کے پانچ قصیدے ہدیہ قادریہ میں شامل ہیں ان میں سے ایک قصیدہ درج کیا جاتا ہے......

شدم بدام غم و رنج مبتلا یا غوث — ترحمی کن و زیں دام کن رہا یا غوث
بہار رفتۂ من در خزاں بجوش آید — دز در گلشن لطف تو گر صبا یا غوث
گر نہ عرض کنم بر تو درد دل چہ کنم — ز آستانۂ عالی روم کجا یا غوث
خدائے را نظر لطف بر من غمگیں — رسید مرتبۂ غم با تنہا یا غوث
نثار اِسم شریف تو جان و مال و تنم — بعشق تو ہمہ ایماں و دیں خدا یا غوث

زاز ہر دو جہاں انتخاب کر دم دبس   بجز تو ہیچ کسم نیست مدعا یا غوث
ڑا بحضرت تو عرض مدعا نہ کنم   تو بادشاہ شاہانی و من گدا یا غوث
دات رزق زتو ہر کسے نمی خواہم   زحبیب خاص عنایت بکن مرا یا غوث
ذی کہ نام تو ہر لحظہ ورد من باشد   نہار و لیل و بہر صبح و ہر مسا یا غوث
وائے درد دل من طبیب کے داند   کہ ہست نام تو ام آیۃ شفا یا غوث
ذات پاک تو در ہر بلا مدد خواہم   ترا بخوانم و ہر دم کنم ندا یا غوث
ذا رسد کہ رسائی زخاک بر فلکم   کہ ہست حکم تو از ارض تا سما یا غوث
ویم راہ حقیقت زتو سوال کنیم   بہر مقام و بگوئیم اعطنا یا غوث
مانہ دفتر صبر و قرار ابتر کرد   نگاہِ لطف باحوال زار ما یا غوث
ضرت تو ہمیں عرض می کند رسوا   ز دست فتنہ تو داری نگہ مرا یا غوث

عربی زبان پر ادیبانہ دسترس رکھتے تھے اور نثر و نظم میں یکساں قدرت تھی۔ مولانا
بدالقادر بدایونی لکھتے ہیں......

> ”در السنہ ثلاثہ عربیہ و فارسیہ و ہندیہ بر نظم و نثر چناں قدرت و مہارات داشتند کہ مرتجلاً قصائد و خطب بلیغہ مشتمل بر صنائع و بدائع لفظیہ و معنویہ قلم برداشتہ می نگاشتند غرضکہ در فنون شعر ہم یگانہ وقت بودند شعراءِ مشاہیر زمانہ از جناب مولانا علیہ الرحمۃ استفادہ می نمودند اکثر کلام بلاغت فصاحت التیام در طرح و منقبت حضرت محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ می بود ہر کہ می دید و می شنید حلاوت ایمانی و لذت عرفانی حاصل می نمود“۔ (تحفۂ فیض، ص:۸)

ایک مرتبہ ولیم میور نے ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی ۱۸۳۷ء کے موقعہ پر قصیدہ کی فرمائش
ی مولانا فیض احمد بدایونی نے رات بھر کوشش کی چند اشعار سے زیادہ نہ لکھ سکے خیال ہوا

کہ یہ ایک حاکم دنیا کی مدح میں کوشش کی، ذرا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت میں کچھ لکھوں[1]۔

اسی وقت لکھنا شروع کیا اور ایک ہی نشست میں ایک سو گیارہ اشعار کا قصیدہ مرتب کر لیا جو نہایت فصیح و بلیغ تھا اس سلسلہ میں مولانا عبدالقادر بدایونیؒ رقم طراز ہیں......

> ''آنکہ روزے بخاطر داشت و اصرار یکے از شاگرداں (ولیم میور) ارادہ تالیف قصیدہ مدح یکے از حاکم دنیا (ملکہ وکٹوریہ) نمودہ بودند و شب مخلی بالطبع نشستہ چند اشعار متعلق مدح او تصنیف ہم فرمودند کہ ناگاہ بعنایت الٰہیہ و توجہات حضور غوث رضی اللہ عنہ مولانا تحریراں قصیدہ نا تمام راترک نمودہ فوراً چاک ساختند و نیت کفارہ ہماں وقت و ہموں جلسہ تحریر قصیدہ اولیں ہدیہ قادریہ کہ مشتمل بر یکصد و یازدہ شعر با چناں ضائع لفظیہ و معنویہ قلم برداشتہ پرداختند و من بعد بعینہٖ قصائد ہدیہ قادریہ ہم در چند جلسہ تالیف نمودند و تصنیف فرمودند''۔ (تحفۂ فیض، ص:۸)

اور ان قصائد عربیہ کی تعریف اعیان و مشاہیر بغداد نے کی اور آپ کی عربی نظم و نثر کو سراہا[2]۔ غرض مولانا پہلی صدی میں برصغیر میں عربی کے صاحب طرز شاعر گزرے ہیں[3]۔ شعرا میں آپ کے مستفیض مولوی فضل الدین قیسؔ، مولوی غلام شاہد فداؔ، مولوی احمد حسین وحشتؔ، مولوی نیاز احمد نیازؔ اور مولوی اشرف علی نفیسؔ وغیرہ مشہور لوگ ہوئے ہیں[4]۔ عربی کا ایک مختصر سا قصیدہ ہدیہ قادریہ سے نقل کیا جاتا ہے......

---

[1] ''تحفۂ فیض'' ازمولانا عبدالقادر بدایونیؒ و اکمل التاریخ جلد دوم ازمولوی یعقوب حسین ضیاء القادری۔

[2] تحفہ فیض، ص:۳۔

[3] العرب (عربی ماہنامہ کراچی) محرم و صفر ۱۳۷۴ھ

[4] ان حضرات کے مختصر سے حالات اکمل التاریخ جلد اول اور تحفہ فیض و طوالع الانوار میں کم و بیش ایک ہی عبارت کے ساتھ درج ہیں۔

ملک الوریٰ بکمالہٖ وھب الھدیٰ لرجالہٖ
مخلوق کے مالک ہوئے اپنے کمال سے، اپنے لوگوں کو ہدایت بخشی
سمح العلی لعیالہٖ قطر الندیٰ بنوالہٖ
بلندی عطا کی اپنی عیال کو برسائی عطا اپنی عطا سے
بضیائہٖ ببھائہٖ بفنائہٖ ببقائہٖ
قسم ہے ان کی ضیا کی بہا کی فنا و بقاء کی
بولائہٖ بوفائہٖ قسماً بکل خصالہٖ
ولا کی وفا کی ان کی ہر خصلت کی قسم ہے
برع العوالم کلھا ملک المکارم جلھا
تمام عالم سے فائق ہوئے، تمام اچھی عادتوں کے مالک ہوئے
جمع المحاسن جمعھا بجمالہٖ و جلالہٖ
تمام خوبیوں کے جامع ہیں اپنے جمال و جلال سے
متعبد لالٰھہ و مقربٌ و مکرمٌ
اپنے خدا کے عبادت گذار ہیں مقرب ہیں مکرم ہیں
و سرور روح محمد ﷺ و قدیر اعین آلہٖ
خوشی ہیں روح محمد ﷺ کی ٹھنڈک انکی آل کے آنکھوں کی
خرق الحجاب فلا ھنالک حاجب و ممانع
حجابات کو چاک کیا، وہاں نہ کوئی حاجب ہے نہ مانع
شرب الکئوس علی الکئوس مسرۃ بو صالہٖ
جام پہ جام پیئے بطور مسرت وصال
ولہ الدھور مطیعۃٌ ولحکمہ لا سیرۃٌ
زمانہ ان کا مطیع اور ان کے حکم کا پابند ہے

والیہ مرجع کلھا بکمالہ و بحالہٖ
سب کا مرجع ان کی طرف ہے ان کے کمال اور حال سے

بلغ الاقاصی والا دانی رشح بحر فیوضہٖ
دور و نزدیک ان کے فیض کے دریا کے چھینٹے پہنچ چکے ہیں

اسف علےٰ اسف علےٰ متکبر و ضلالہٖ
افسوس پر افسوس منکر پر اور اس کی گمراہی پر

واتاک غُدۃ سائل و دعاک زمرۃ مائل
بہت سے سائل آپ کے جا کر آئے بہت سے گروہ نے آپ سے مانگا

فعلمت مضمر حالہٖ و حبوت قبل سوالہٖ
اسکے پوشیدہ حال کو آپ نے جان لیا اور قبل سوال آپ نے عطا فرمایا

تصنیفات :- مولانا فیض احمد تصانیف کثیرہ کے مالک تھے۔ طبیعت میں استغناء بدرجہ کمال تھا اکثر مسودات وتحریرات شاگرد لے گئے اوران کی واپسی نہ ہوئی بعض مسودات غدر میں ضائع ہوگئے اس طرح اکثر تصانیف مشہور نہ ہوئی[1]۔ آپ کی تصانیف سے علم کلام میں رسالہ تعلیم الجاہل ہے جو شاہ محمد اسحٰق دہلوی کی کتاب تفہیم المسائل کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ صدرا شیرازی نیز تعلیقات علیٰ فصوص الفارابی ہیں اس کے علاوہ مجموعہ نثر وقصائد عربیہ موسومہ ہدیہ قادریہ ہے۔ یہ بے مثل خزینہ وگنجینہ کمالات ہے، اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ نثر کے فقرے ہیں اور اسی طرح ایک ہزار ایک سو گیارہ اشعار عربی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی منقبت میں ہیں ہدیہ قادریہ مولانا عبدالمقتدرؒ بدایونی کے مقدمہ اور حاشیہ کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں مطبع نسیم سحر بدایوں سے شائع ہوگیا ہے۔

---

[1] تحفۂ فیض، ص:۸۔

ہدیۂ قادریہ کی طباعت کے بعد ہی بعض حضرات کے اصرار پر مولانا عبدالقادر بدایونی نے ان کے حالات میں تحفۂ فیض مرتب کیا جو کہ فخر المطابع میرٹھ سے طبع ہوا ہے۔

اولاد :- مولانا فیض احمد بدایونی کو ان کے ماموں مولانا فضل رسول کی صاحبزادی منسوب تھیں جن سے صرف ایک صاحبزادے مولانا حکیم سراج الحق تھے جو کہ ۲۰/ رمضان المبارک ۱۲۴۶ھ کو پیدا ہوئے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ اپنے والد مولانا فیض احمد اور مولانا نور احمد بدایونی سے حاصل کئے طب حکیم مولانا فضل رسول بدایونی سے پڑھی، معقول، فلسفہ، ریاضی میں مہارت تامہ حاصل کی۔ طب میں کمال خصوصی حاصل تھا بوارق محمدیہ مصنفہ حضرت مولانا فضل رسولؒ کے خاتمہ میں قاضی معین الدین کیفی میرٹھی لکھتے ہیں......

> ”تحصیل علوم عقلیہ ونقلیہ از والد ماجد خود فرمودہ اند امام عصر و علامہ دہر ہستند در جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ ید طولیٰ دارند بالخصوص در فن طب اگر شیخ وقت گفتہ اید بجا است تالیفات جناب موصوف بسیار از آنجلہ شرح رسائل معمیات بہاء الدین عاملی است حاشیہ معتقد المنتقد و سراج الحکمۃ در طبیعات و دیگر رسائل متعددہ در فن طب قصائد بلیغہ عربی و فارسی بسیار اند بسیار اند“۔

اکثر آپ روساء دانپور و دھرم پور کی مصاحبت و ملازمت میں رہے، ۲۸/ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ ۷۶ برس کی عمر میں دانپور میں انتقال کیا۔ صاحب تصنیف تھے شرح رسائل معمیات بہاؤ الدین عاملی مطبوعہ ہے طبیعات میں شرح رسالہ معتقد المنتقد لکھی عربی نظم میں مثل اپنے والد کے مہارت کامل رکھتے تھے۔ صاحب درس تھے۔ آپ کے شاگردوں میں مطیع احمد نقوی بقائی بدایونی، مولانا عاشق حسین بدایونی (چاہ میر) مولوی باقر علی بدایونی، مولوی میر نذر علی بدایونی، مولوی تفضّل حسین گڑھ کمشنری، مولوی محمد حسین سیوہاروی، حکیم محمد حسین سہسوانی، سید اولاد حسین، حکیم تصور علی صاحب اکبر آبادی، مولوی

مقبول حسین مشہور مفسر مذہب امامیہ مولوی محمد حسین بٹالوی (سرگردہ جماعت اہل حدیث) مولوی جمال الدین پنجابی اور سید عبداللہ کابلی وغیرہ مشہور لوگ ہوئے ہیں۔ حکیم سراج الحق کے ایک صاحبزادے منیر الحق اور ایک دختر تھیں۔ منیر الحق ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ نہایت طبّاع و ذہین تھے۔ مدرسہ قادریہ بدایوں میں تحصیل علم کی درس نظامی کی تکمیل بہت تھوڑے عرصہ میں کر لی۔ ۱۲۹۹ھ میں اپنے والد کے ہمراہ حج کو گئے آخری ایام حج میں مکہ معظّمہ میں ۱۸ر سال کی عمر میں انتقال کیا اس طرح مولانا فیض احمد بدایونی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حکیم سراج الحق کی لڑکی کا سلسلہ اولاد موجود ہے۔ یہ لڑکی عبدالحق ولد مولوی انوار الحق عثمانی (صاحب طوالع الانوار) سے منسوب تھیں۔ عبدالحق کے صاحبزادے حکیم ظہور الحق قادری ہوئے جو کہ پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتے ہیں اور صاحب اولاد ہیں۔ مولانا سراج الحق نے آخر میں حکیم افتخار الحق کو اپنے آغوش تربیت میں مثل اولاد کے پرورش کیا۔ یہ بڑے نامی طبیب ہوئے لکھنؤ میں مطب کیا۔ مولانا حکیم سراج الحق کے ذخیرہ کتب و تصنیفات کے مالک بھی یہی ہوئے۔ آخر میں تصوف کا غلبہ ہو گیا تھا اور الہ آباد سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں انتقال ہوا۔

خاتمہ :- یہ داستان حیات ہے مولانا فیض احمد بدایونی کی جنہوں نے ملک وملّت کی آزادی کے لئے نہ صرف مصائب وآلام جھیلے بلکہ جان عزیز تک قربان کر دی اور جیتے جی انگریز کو منہ نہ دکھایا۔ انھیں مجاہدین کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی کے بعد برصغیر آزاد ہوا اور مسلمانوں کا نیا ملک پاکستان وجود میں آیا۔

تمام شد

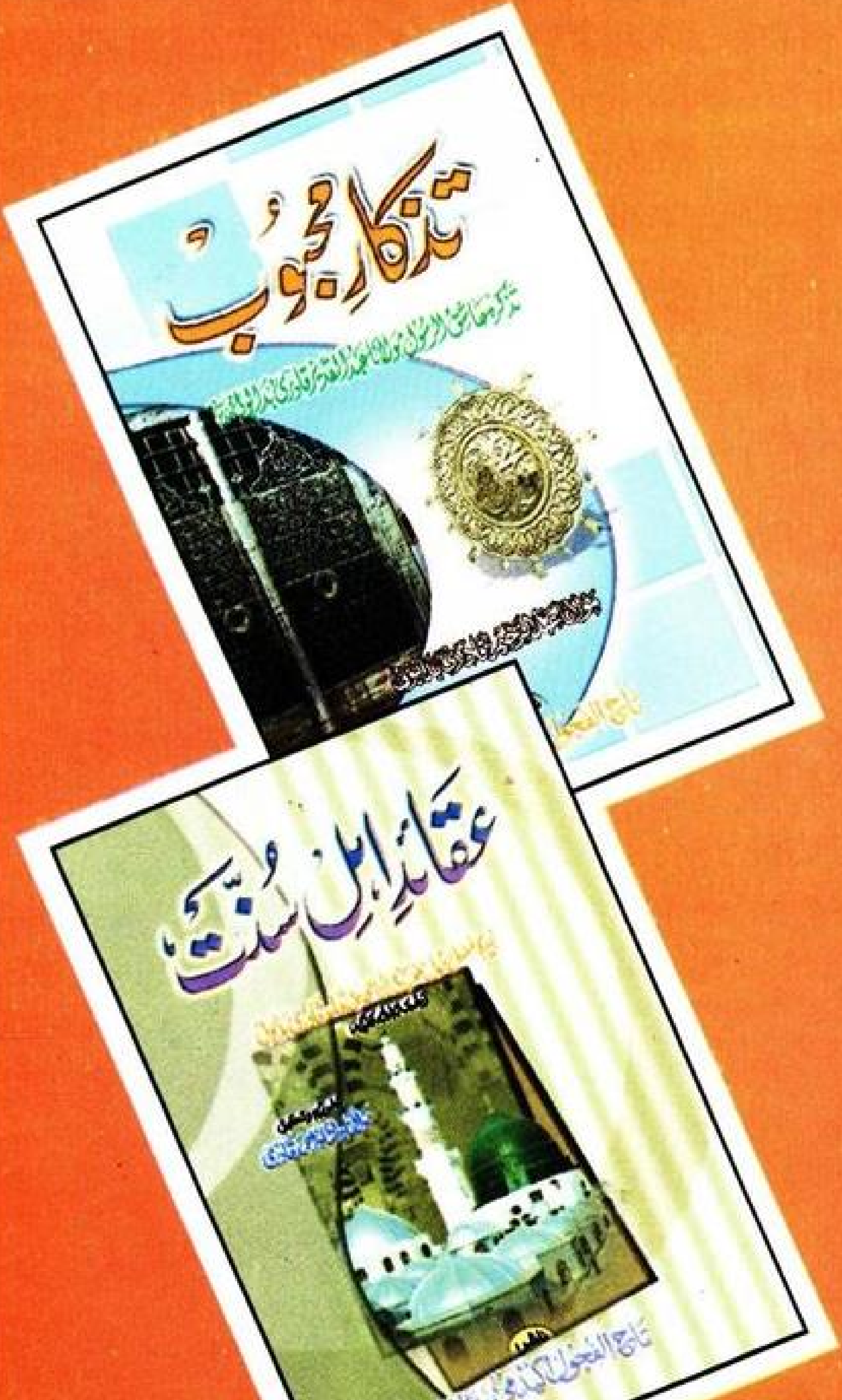
تذکار محبوب
عقائد اہل سنت

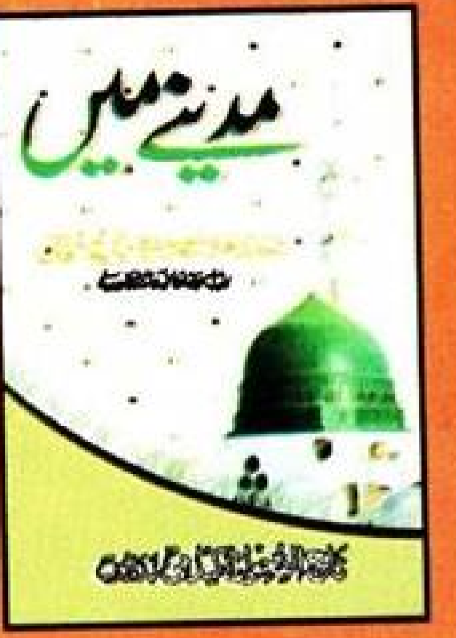

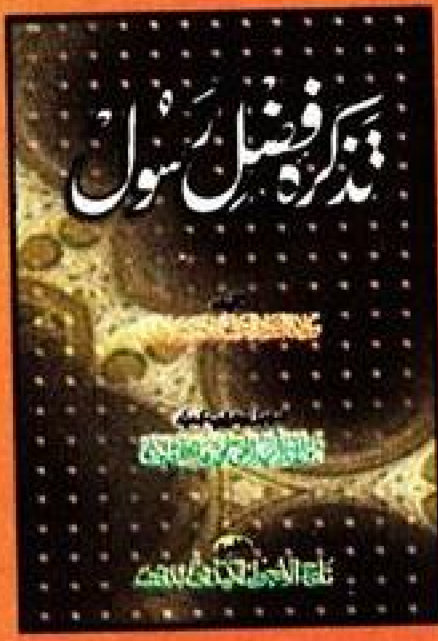
تذکرہ فضل رسول

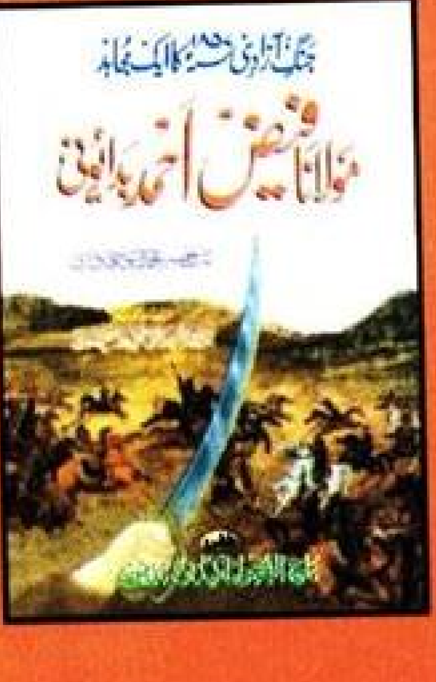
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد
مولانا فیض احمد بدایونی

PRICE 20

ناشر: تاج الفحول اکیڈمی بدایوں ۔ تقسیم کار: مکتبہ جام نور دہلی